جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودُودی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مضامین

دیباچہ..8

مقصد اور مسلک..10

پورے نظامِ زندگی کو خدا کی بندگی اور انبیاء کی ہدایت پر قائم کرنا 10

ہماری دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے..11

اسلام، مسلم قومیت اور ہم 12

ہمارا تصور دین..13

ہمارے معترضین..14

مذہب اور سیاست 15

اسلامی حکومت 18

ہمارا مسلک..20

اختلاف مسلک کا حق..21

آغاز کار

پہلا مرحلہ: تنقید اور تبلیغ و تلقین 22

مسلمانوں کے صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنانا..22

جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید 24

اسلامی نظام زندگی کو معقول و مدلل طریقے سے پیش کرنا..25

ہمارے کام کی ترتیب: 26

قومی، جمہوری، لادینی حکومت کی ابتداء 27

مسلمانوں کا تذبذب 29

واحد ہندی قومیت کے خطرات کی نشاندہی 30

اسلامی نظریہ حیات کے کے جدوجہد کی دعوت 31

دو نہایت اہم اور دردناک سوالات 33

جماعت اسلامی کی تاسیس 33

دوسرا مرحلہ

تنظیم و تربیت 35

اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود 35

جماعت اسلامی کی وجۂ تاسیس 36

مراحل میں تقسیم کا مطلب 37

دوسرے مرحلے کے مطبوعات 37

جماعت کی تاثیر کا مقصد 38

صالح جماعت کے کارکنوں کے اوصاف 39

قائدانہ صلاحیتوں کے حامل کارکن 40

پہلے اپنی اصلاح 42

دعوت کا مجسم نمونہ 43

پتّہ مار کر ٹھوس کام کرنے کی عادت 43

یک رنگ مومن مسلم 44

برتر اوصاف اور صلاحیت کار 44

صالح گروہ کی تنظیم 45

صالح عنصر کو چھانٹنا اور منظم کرنا 46

طریقِ تنظیم و تربیت 50

ہمارا طریقِ تربیت 52

دعوت و تبلیغ 54

نظمِ جماعت 55

روحِ تنقید 56

تیسرا مرحلہ

توسیع اور عملی اقدام 58

انقلاب ٤٧ء کے اثرات 59

پہلا اثر تقسیم جماعت 59

انقلاب ١٩٤٧؁ء اور مسلمانانِ ہند کی حالت 60

جماعت کی آزمائش 63

پہلی آزمائش 63

دوسری آزمائش 64

تیسری آزمائش 65

پہلا قدم۔ اسلامی ریاست کا واضح تصور پیش کرنا 65

دوسرا قدم، اسلامی ریاست کا چہار نکاتی فارمولا 67

جماعت کے راہنماؤں کی گرفتاریاں 68

قرارداد مقاصد اور اس کے اثرات 69

اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کا فرق 71

متحدہ ہندوستان میں ہمارا موقف 72

نیا لائحۂ عمل 74

مقصد اول 75

مزاحم طاقتیں 76

(۱) اشتراکیت 76

(۲) مغربی الحاد فسق و اباحیت 77

علماء کرام 77

سیلاب کا مقابلہ سیلاب سے 78

مقصد دوم 80

تشخیص مرض 80

موجودہ مسلم معاشرے کے عناصرِ ترکیبی ! 81

پہلا عنصر 84

دوسرا عنصر 85

تیسرا عنصر 87

تجویزِ علاج 89

اصلاحی پروگرام 90

مقصدِ سوم 92

مقصد چہارم 97

ضمیمہ نمبر ۱ 103

۱۔ (متعلقة صفحہ نمبر۷۶) 103

۲۔ طریقۂ انتخاب کی اصلاح کا مسئلہ 107

ضمیمہ نمبر ۲ فہرست مطبوعات 109

پہلا مرحلہ 109

دوسرا مرحلہ 109

تیسرا مرحلہ 110

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے وہ پچھلے اٹھارہ سال میں دو مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب تیسرا مرحلہ شروع ہے۔ پہلا مرحلہ خالص تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کا تھا جس کا سلسلہ تقریباً ۹ سال جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ تنظیم و تربیت کا تھا اور اس میں تقریباً ٦ سال صرف ہوئے۔ اب یہ تیسرا مرحلہ توسیع اور عملی اقدام کا ہے جسے شروع ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ اس مرحلہ میں عام لوگ اس جماعت سے روشناس ہو رہے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جماعت کیا ہے، کس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے، اس کا نظام کس قسم کا ہے، اب تک اس نے کیا کام کس طرح کیا ہے اور اب کیا کرنا چاہتی ہے، پھر بہت سے لوگ جو اب اس جماعت میں داخل ہو رہے ہیں ان کو بھی یہ جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جس جماعت کے وہ کارکن ہیں وہ اس کی پچھلی تاریخ کیا ہے۔ وہ کن مرحلوں سے گزرتی ہوئی اپنے موجودہ مقام تک پہنچی ہے اور اب جو لائحۂ عمل اس کے سامنے ہے اس کی اصولی اور فکری بنیادیں کیا ہیں۔ ان صفحات میں کوشش کی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ یہ سب باتیں بیان کر دی جائیں تاکہ جماعت کا یہ تعارف ہماری دعوت کے کام میں مددگار ہو سکے۔

لاہور، ۷ / محرم ۱۳۷۱ھ - ۸ / اکتوبر ۱۹۵۱ء

ابو الاعلیٰ

مقصد اور مسلک

پورے نظامِ زندگی کو خدا کی بندگی اور انبیاء کی ہدایت پر قائم کرنا

جماعتِ اسلامی جس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال، مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت، معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ اور (بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیھم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے۔"

یہ مقصد اول روز سے ہمارے پیشِ نظر رہا ہے اور آج بھی یہی ایک مقصد ہے جس کے لیے ہم کام کر رہے ہیں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ ہمارے پیشِ نظر کبھی تھا، نہ آج ہے، نہ ان شا اللہ کبھی ہوگا۔ آج تک جس کام سے بھی ہم نے دلچسپی لی ہے اسی مقصد کہ لیے لی ہے، اور اسی حد تک لی ہے جس حد تک ہماری دانست میں اس کا تعلق اس مقصد سے تھا۔

جس چیز کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کا جامع نام قرآن کی اصطلاح میں 'دینِ حق' ہے یعنی وہ نظامِ زندگی (دین) جو حق (پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق اللہ کی بندگی و اطاعت) پر مبنی ہو۔ مگر اس کے لیے کبھی کبھی ہم نے "حکومتِ الٰہیہ" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے جس کا مفہوم دوسروں کے نزدیک چاہے جو کچھ بھی ہو، ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ "اللہ کو حاکمِ حقیقی مان کر پوری انفرادی و اجتماعی زندگی اس کی محکومیت میں بسر کرنا۔" اس لحاظ سے یہ لفظ بالکل "اسلام" کا ہم معنی ہے۔ اسی بنا پر ہم ان تینوں اصطلاحوں (دینِ حق، حکومتِ الٰہیہ اور اسلام) کو مترادف الفاظ کی طرح بولتے رہے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کا نام ہم نے اقامتِ دین، شہادتِ حق اور تحریکِ اسلامی رکھا ہے جس میں سے پہلے

دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور دوسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں سے کسی پر اگر لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا، ہمارا مفہوم مراد لیتے تو امید نہ تھی کہ اس پر وہ ناراض ہوتے۔

ہماری دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے

ہمارے نزدیک اسلام ان لوگوں کی جائیداد نہیں ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں بلکہ خدا نے یہ نعمت ان سب کے لیے بھیجی ہے جو انسان پیدا ہوئے ہیں خواہ وہ روئے زمین کے کسی خطے میں بستے ہوں۔ اس بنا پر ہمارا مقصد محض مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی زندگی کو دینِ حق پر قائم کرنا ہے۔ مقصد کی یہ وسعت آپ سے آپ تقاضا کرتی ہے کہ ہماری اپیل عام رہے اور کسی مخصوص قوم کے مفاد کو مدِ نظر رکھ کر کوئی ایسا طرزِ عمل نہ اختیار کیا جائے جو اسلام کی اس عام اپیل کو نقصان پہنچانے والا ہو یا اسکی نقیض واقع ہوتا ہو۔ مسلمانوں سے ہم کو دلچسپی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم ان میں پیدا ہوئے ہیں اور وہ ہماری قوم ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہماری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کو مانتے ہیں۔ دنیا میں اس کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں، نوعِ انسانی تک اس کا پیغام پہنچانے کے لیے انہی کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اور دوسروں کے لئے اس پیغام کو مؤثر بنانا اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں پورے اسلام کا صحیح نمونہ پیش کریں۔ اس بناء پر ہمارا راستہ ان لوگوں کے راستے سے ہمیشہ الگ رہا ہے اور آج بھی الگ ہے، جنہیں مسلمانوں سے اصل دلچسپی اس لیے ہے کہ وہ ان کی قوم ہیں اور اسلام سے یا تو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے یا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ انکی قوم کا مذہب ہے۔

اسلام، مسلم قومیت اور ہم

ہم نے اپنے مقصد کے لحاظ سے اپنی تحریک کو اس طرز پر اٹھایا ہے کی ایک طرف اس کی چعوت تمام انسانوں کے لیے عام رہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کو اسلام کی مکمل اور صحیح علمی اور عملی شہادت دینے کے لیے تیار کیا جائے۔ ہم نے کبھی اسلام اور مسلم قومیت کے فرق و امتیاز کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ ہم نے اسلام کے اصول و احکام اور اسلامی دعوت کے مفاد کو ہمیشہ قوم اور قومی مفاد پر مقدم رکھا ہے اور جہاں کہیں ان دونوں چیزوں میں تناقض واقع ہوا ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کی خاطر قوم اور اس کے مفاد سے لڑ جانے میں تامل نہیں ہوا ہے۔ ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لیے کوشش کی اس لیے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود برقرار رہے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لیے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام بھی چاہا تو اس غرض سے نہیں کی روئے زمین پر ایک اور ٹرکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کی ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظامِ زندگی کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنی پیش کرے۔ ہماری اس پوزیشن کو وہ لہگ کبھی نہ سمجھ سکے جو اسلام اور مسلم قومیت کو گڈمڈ کرتے ہیں یا قوم کو دین پر مقدم رکھتے ہیں، یا دین کے بجائے صرف قوم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے راستے اگر کبھی ملے بھی تو عارضی طعر پر اس جگہ جہاں اتفاقاً اسلام نے ہمیں اور ان کو جمع کر دیا۔ ورنہ اکثر ہمارے اورین کے طرزِ فکر و عمل میں تصادم ہی رہا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہم کو بارہا "غداری" کے طعنے بھی سننے پڑے ہیں مگر یہ طعنے ہمارے لیے بالکل بے معنی ہیں۔ ہم وفاداری کا مستحق صرف خدا اور رسولؐ کو سمجھتے ہیں۔ پھر اس کو خدا اور رسولؐ کا وفادار ہو۔ اس وفاداری سے انحراف تو

البتہ ہمارے نزدیک دنیا و آخرت میں لعنت کا موجب ہے لیکن اگر اس وفاداری میں ہم ثابت قدم ہوں تو پھر دوسری جس چیز کا بھی ہمیں غدار ٹھیرایا جائے وہ ہمارے لیے باعثِ شرم نہیں بلکہ باعثِ فخر ہے۔

ہمارا تصور دین

"دین حق" اور "اقامتِ دین" کے تصور میں بھی ہمارے اور بعض دوسرے لوگوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ہم دین کو محض پوجا پاٹ اور چند مخصوص مذہبی عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے نزدیک یہ لفظ طریقِ زندگی اور نظامِ حیات کا ہم معنی ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں اور تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ زندگی کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر الگ الگ اسکیموں کے تحت چلایا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تقسیم اگر کی بھی جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو انسانی جسم کے اعضاء کی طرح ایک دوسرے سے ممیز ہونے کے باوجود آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کے وہ سب مل کر ایک کُل بن جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک ہی روح جاری و ساری ہوتی ہے۔ یہ روح اگر خدا اور آخرت سے بے نیازی اور تعلیم انبیاء سے بے تعلقی کی روح پر ہو تو پوری زندگی کا نظام ایک دینِ باطل بن کر رہتا ہے اور اس کے ساتھ خدا پرستانہ مذہب کا ضمیمہ اگر لگا کر رکھا بھی جائے تو مجموعی نظام کی فطرت بتدریج اسکو مضمحل کرتے کرتے آخر کار بالکل محو کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ روح خدا اور آخرت پر ایمان اور تعلیمِ انبیاء کے اتباع کی روح ہو تو اس سے زندگی کا پورا نظام ایک دینِ حق بن جاتا ہے جس کے حدود عمل میں ناخدا شناسی کا فتنہ اگر کہیں رہ بھی جائے تو زیادہ دیر تک پنپ نہیں سکتا۔ اس لیے ہم جب "اقامتِ دین" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب مسجدوں میں دین قائم کرنا، یا چند مذہبی عقائد اور اخلاقی احکام کی تبلیغ کر دینا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے

ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ گھر اور مسجد، کالج اور منڈی، تھانے اور چھاؤنی، ہائی کورٹ اور پارلیمنٹ، ایوانِ وزارت اور سفارت خانے، سب پر اس ہی ایک خدا کا دین قائم کیا جائے جس کو ہم نے اپنا رب اور معبود تسلیم کیا ہے اور سب کا انتظام اسی ایک رسولؐ کی تعلیم کے مطابق چلایا جائے جسے ہم اپنا ہادیٔ برحقؐ مان چکے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہماری ہر چیز کو مسلمان ہونا چاہئیے، اپنی زندگی کے کسی پہلو کو بھی ہم شیطان کے حوالے نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں سب کچھ خدا کا ہے۔ شیطان یا قیصر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ہمارے معترضین

ہماری ان باتوں پر وہ سب لوگ برہم ہیں جنھوں نے مذہب کا ایک محدود تصور اختیار کر رکھا ہے۔ جو تفریقِ دین و دنیا اور امتیازِ مذہب و سیاست کے قائل ہیں۔ جن کے نزدیک زندگی خدا اور قیصر کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئیے، اور جن کی نگاہوں میں خدا پرستی کا دین، بے خدا تمدن و سیاست کے ساتھ زندگی کا بٹوارہ قبول کر سکتا ہے اور صرف مسجد و خانقاہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باقی سب کچھ اپنے حریف کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ لوگ ہم پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

مذہب اور سیاست

کوئی کہتا ہے کہ تم مذہب کی تبلیغ کرو۔ سیاست میں کیوں دخل دیتے ہو؟ مگر ہم اس بات کے قائل ہیں کہ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اب کیا یہ لوگ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہماری سیاست پر چنگیزی مسلط رہے اور ہم مسجد میں "مذہب" کی تبلیغ کرتے رہیں؟ اور آخر وہ مذہب کون سا ہے

جس کی تبلیغ کے لیے وہ ہم سے کہہ رہے ہیں؟ اگر وہ پادریوں والا مذہب ہے جو سیاست میں دخل نہیں دیتا تو ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ قرآن و حدیث کا مذہب ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ تو وہ سیاست میں محض دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اُس کو اپنا ایک جزو بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے، اب سیاسی گروہ بن گئے ہو۔ حالانکہ ہم پر کبھی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے "مذہبی" رہے ہوں، اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو اسلام کے پیرو ہیں اور اسی کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جتنا "مذہبی" ہے اتنے ہی ہم مذہبی ہیں اور ابتداء سے تھے۔ اور جتنا "سیاسی" ہے اتنے ہی ہم سیاسی ہیں اور ابتداء سے تھے۔ تم نے نہ کل ہمیں سمجھا تھا جب کہ ہم کو "مذہبی" گروہ قرار دیا۔ اور نہ آج سمجھا ہے جب کہ ہمارا نام "سیاسی جماعت" رکھا۔ سیاست اور مذہب میں تمہارا استاد یورپ ہے۔ اس لئے نہ تم نے اسلام کو سمجھا اور نہ ہمیں۔

کوئی کہتا ہے کہ خدا تو صرف معبود ہے، تم نے یہ سیاسی حاکمیت اس کے لیے کہاں سے ثابت کردی؟ اور اس پر غضب یہ ہے کہ تم اس حاکمیت کو اللہ کے لئے مخصوص کرتے ہو اور انسانی حاکمیت کے منکر ہو۔ یہ تو خالص خارجیت ہے۔ کیونکہ تمہاری طرح خارجی بھی یہی کہتے تھے کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ مگر ہمارے نزدیک قرآن و حدیث کی رو سے خدا کا حق صرف عبادت و پرستش ہی نہیں بلکہ اطاعت و عبدیت بھی ہے۔ ان میں سے جس حق میں بھی خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا جائے گا، شرک ہوگا۔ بندوں میں سے کسی کی اطاعت اگر کی جا سکتی ہے تو صرف خدا کے اذنِ شرعی کی بناء پر کی جا سکتی ہے اور وہ بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر۔ رہا خدا سے بے نیاز ہو کر مستقل بالذات مطاع ہونا تو وہ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حق بھی نہیں ہے کجا کہ کسی انسانی ریاست یا سیاسی و تمدنی ادارے کا حق ہو۔ جس قانون، عدالت اور حکومت میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مستند نہ مانا جائے، جس کا

بنیادی اُصول یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے جملہ معاملات میں اصول اور فروع تجویز کرنا انسانوں کا اپنا کام ہے اور جس میں قانون ساز مجلسیں خدائی احکام کی طرف رجوع کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہ تسلیم کرتی ہوں اور عملاً ان کے خلاف قوانین بناتی ہوں اس کے اطاعت کے لزوم تو درکنار جواز تک کا کوئی ثبوت قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے۔ اس بلا کو زیادہ سے زیادہ صرف برداشت کیا جا سکتا ہے جب کہ انسان اس کے پنجہ اقتدار میں گرفتار ہو جائے۔ مگر جو شخص ایسی حکومتوں کے حقِ فرمانروائی کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات کو ایک اصولِ برحق کی حیثیت سے مانتا ہے کہ خدائی ہدایت کو چھوڑ کر انسان بطورِ خود اپنے تمدن، سیاست اور معیشت کے اصول و قوانین وضع کر لینے کے مجاز ہیں۔ وہ اگر خدا کو مانتا ہے تو شرک میں مبتلا ہے ورنہ زندقہ میں۔ ہمارے اس مسلک کو ”خارجیت“ سے تعبیر کرنا مذہب اہل سنت اور مذہبِ خوارج، دونوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ علماء اہلِ سنت کی لکھی ہوئی کتب اصول میں سے جس کو چاہیے اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں یہی لکھا ملے گا کہ حکم دینے کا حق اللہ کے لئے خاص ہے۔ مثال کے طور پر علامہ آمدی اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں لکھتے ہیں کہ اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ ولا حکم الا ما حکم بہ ”جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور حکم صرف وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے“ اور شیخ محمد خضری اپنی "اصول الفقہ" میں کہتے ہیں: ان الحکم ھو خطاب اللہ فلا حکم الا اللہ و ھذہٖ قضیۃ اتفق علیھا المسلمون قاطبہ۔ "در حقیقت حکم اللہ کے فرمان کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔" یہ صرف دو خارجیوں کے اقوال ہم نے بطور مثال نقل کر دیئے ہیں۔ اس طرح کے "خوارج" کی آم جس قدر چاہیں طویل فہرست دی جا سکتی ہے۔

اسلامی حکومت

کچھ اور لوگ ہیں جو چندرا چندرا کر پوچھتے ہیں کہ حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کا قیام کس نبی کی دعوت کا مقصود رہا ہے؟ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن اور توراۃ میں عقائد و عبادات کے ساتھ دیوانی اور فوجداری قوانین اور صلح و جنگ کے احکام، اور معیشت و معاشرت کے قواعد و ضوابط، اور سیاسی تنظیم کے اصول بیان ہوئے ہیں کیا یہ سب محض تفنن طبع کے لیے ہیں؟ کیا یہ آپ کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے کہ کتاب اللہ کی تعلیمات میں سے جس چیز کو چاہیں جزو دین مانیں اور جسے چاہیں غیر ضروری زوائد میں شمار کریں؟ کیا انبیاء بنی اسرائیل علیھم السلام اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سیاسی نظام قائم کیے وہ ان کی پیغمبرانہ دعوت کے مقاصد میں سے نہ تھے؟ محض ملاقات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنا شوقِ فرمانروائی پورا کیا تھا؟ کیا دنیا میں کوئی قانون اس لئے بھی بنایا جاتا ہے کہ صرف اس کی تلاوت کرلی جائے، اس کا نفاذ سرے سے مقصود ہی نہ ہو؟ کیا واقعی ایمان اسی چیز کا نام ہے کہ ہم روز اپنی نمازوں میں کتاب اللہ کی وہ آیات پڑھیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اصول اور احکام بیان ہوئے ہیں اور رات دن ہماری زندگی کے اکثر و بیشتر معاملات ان کے خلاف چلتے رہیں۔

ہمارا مسلک

خدا کی بندگی جس پر ہم پورے نظامِ زندگی کو قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں بھی ہمارا ایک واضح مسلک ہے اور وہ مختلف گروہوں کو مختلف وجوہ سے پسند نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک ہر شخص اس کا مختار نہیں ہے کہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جس طرح چاہے خدا کی بندگی کرے بلکہ اس کی ایک ہی صحیح صورت ہے اور وہ اس شریعت کی پابندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ اس

شریعت کے معاملے میں کسی مسلمان کے اس حق کو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس کی جن باتوں کو چاہے قبول کرے اور جن باتوں کو چاہے رد کر دے۔ بلکہ ہم اسلام کے معنی ہی اطاعتِ حکمِ خداوندی اور اتباعِ شریعت محمدیؐ کے سمجھتے ہیں۔ شریعت کے علم کا ذریعہ ہمارے نزدیک صرف قرآن پاک نہیں ہے بلکہ حدیثِ رسولؐ بھی ہے اور قرآن و حدیث سے استدلال کا صحیح طریقہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے نظریات پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر ڈھالے بلکہ یہ ہے کہ آدمی اپنے نظریات کو خدا اور رسولؐ کی ہدایات پر ڈھالے پھر ہم نہ تو تقلید جامد کے قائل ہیں جس میں اجتہاد کی جگہ نہ ہو اور نہ ایسے اجتہاد کے قائل ہیں کہ ہر بعد کی نسل اپنے سے پہلے کی نسلوں کے سارے کام پر پانی پھیر دے اور بالکل نئے سرے سے ساری عمارات اٹھانے کی کوشش کرے۔

اس مسلک کا ہر جزو ایسا ہے جس سے ہماری قوم کا کوئی نہ کوئی گروہ ہم سے ناراض ہے۔ کوئی سرے سے خدا کی بندگی کا قائل ہی نہیں ہے، کوئی شریعت سے بے نیاز ہو کر اپنی صواب دید کے مطابق خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے۔ کوئی شریعت میں اپنا اختیار چلانا چاہتا ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ اسے پسند ہے وہ اس شریعت میں رہے اور جو اسے پسند نہیں ہے وہ شریعت سے خارج ہو جائے، کوئی قرآن و حدیث سے قطع نظر کر کے اپنے من گھڑت اصولوں کا نام اسلام رکھے ہوئے، کوئی حدیث کو چھوڑ کر صرف قرآن کو مانتا ہے۔ کوئی اصول اور نظریات کہیں باہر سے لے آیا ہے یا اپنے دل سے گھڑ لایا ہے اور پھر زبردستی قرآن و حدیث کے ارشادات کو ان پر ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے، کسی کو تقلید جامد پر اصرار ہے اور کوئی تمام پچھلے آئمہ کے کارناموں کو دریا بُرد کر کے نیا اجتہاد کرنا چاہتا ہے۔

اختلاف مسلک کا حق

ہمارا راستہ ان سب گروہوں سے الگ ہے اور ہم مجبور ہیں کہ ان سے اختلاف بھی کریں اور ان کے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ بھی کریں، اسی طرح دوسروں کے بھی اس حق کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جس معاملے میں بھی ہم کو غلطی پر سمجھتے ہیں اس میں ہم سے اختلاف کریں اور ہمارے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ کریں۔ اب ہر شخص جو ہندوستان و پاکستان میں رہتا ہے اور مختلف گروہوں کے لٹریچر پر نظر رکھتا ہے خود ہی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اپنی تنقید و تبلیغ میں ہمارا رویہ کیا رہا ہے اور ہمارے مخالفین نے جواب میں کس تہذیب و دیانت اور معقولیت کا ثبوت دیا ہے۔

آغاز کار

پہلا مرحلہ: تنقید اور تبلیغ و تلقین

پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ جماعت اسلامی جس دعوت پر قائم ہوئی ہے اس کا مقصد اول روز سے یہ تھا کہ دین حق کو اس کی اصلی اور مکمل صورت میں پورے نظام زندگی پر غالب کیا جائے۔ اس مقصد کے مختلف پہلووں سے مسلمانوں کے مختلف الخیال اشخاص اور گروہوں کو جس جس نوعیت کے اختلافات ہیں ان کی طرف بھی مختصر اشارات کیے جا چکے ہیں۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ سال میں یہ تحریک کن مراحل سے کزرتی ہوئی آرہی ہے۔ اس بیان سے مقصود محض تاریخ نگاری نہیں ہے۔ دراصل جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ کہ اپنے نصب العین کے لیے ہم نے اب تک جو کام جس طرح کیا ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا ان کی لیے آسان کو۔

مسلمانوں کے صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنانا

۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب اس تحریک کا آغاز ہوا اس وقت ہمارے سامنے اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنایا جائے۔

عام انسانوں کے بجائے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو ہم نے اس لیے خطاب کیا کہ دنیا میں مسلمان اسلام کے جیتے جاگتے نمائندے ہیں۔ خواہ وہ اپنی حیثیت کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ بحر حال دنیا ان کو نظر انداز کر کے خالص اور مجرّد اسلام کو محظ الفاظ کی مدد سے سمجھنے کے لیے تیار نہیں

ہو سکتی۔ اسکو جب کبھی اسلام کی دعوت دی جائے گی، اسکی نگاہ لا محالہ ان لوگوں کی طرف اٹھے گی جو پہلے سے اس دین کے پیرو ہیں اور اگر وہ اپنی زندگی میں انسانیت کا کوئی دلکش نمونہ پیش نہ کر رہے ہوں تو دنیا سے یہ توقع کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اس دین کے اتباع سے اپنی فلاح و بہبود کی امیدیں وابستہ کرے گی۔ اس لیے دنیا میں نظام حق برپا کرنے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ اگر سارے مسلمان نہیں تو کم از کم ان میں سے کوئی ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہو جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہو۔ مسلمانوں میں سے بھی عوام کو چھوڑ کر خاص طور پر ہم نے ان کے اہلِ دماغ طبقے کو خطاب کیا۔ کیوں کہ ایک قوم کے اصل رہنما اس کے اہلِ دماغ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ زندگی میں جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں عوام ان کے پیچھے اسی راستے پر ہو لیتے ہیں۔ اس لیے ہم نے عام مسلمانوں کی اعتقادی و عملی اصلاح سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنی کوششوں کو ان خواص کی اصلاح پر مرکوز کر دیں جو اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لیے بھی ضروری تھی کی معاشرے کی عام اصلاح کے لیے جو کام ہم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے کارکن ہم کو بہر حال اہلِ دماغ طبقے ہی سے مل سکتے تھے۔ پھر اصلاح کے معاملے میں بھی ہم نے اخلاقی و عملی اصلاح پر فکری و ذہنی اصلاح کو مقدّم رکھا کیوں کہ خیال ہی اخلاق و کردار کی جڑ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں کوئی عملی تغیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نظریات نہ بدلیں، اس کے سوچنے کا انداز نہ بدلے، اور اسکی اقدار نہ بدل جائیں۔

یہ تھا اس دعوت کی راہ میں ہمارا پہلا قدم۔ یہ خالص تنقید اور تبلیغ و تلقین کا مرحلہ تھا جو ۳۳؁ء سے ۴۱؁ء تک پورے ۹ سال رہا۔

جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید

اس میں ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے ان اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور ان اثرات پر بھی جنھیں آج ہم اپنی زندگی میں لیے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے ان کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے علمی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مدارسِ فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہاد مطلق کے مدعیوں پر بھی۔ حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی، دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو ہمارے پیش نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحب فکر لوگوں کی ان ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لیے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اس شاہراہ کو صاف صاف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لیے جب کبھی ہماری تنقیدوں پر بگاڑ کر کسی نے ہم کو بحث میں الجھانا چاہا ...... اور اس کی نوبت بارہا آئی ہے ...... تو ہم نے اس کے ساتھ الجھنے سے انکار کر دیا کیونکہ ہمارے لیے یہ بحثیں مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ اپنے نصب العین کی راہ صاف کرنے کے لیے ہم نے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر انھیں اختیار کیا تھا اور ہم ان میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اسلامی نظام زندگی کو معقول و مدلل طریقے سے پیش کرنا

دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظام زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کیا ہے۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں، اس کا نظریہ کائنات و انسان کیا ہے، اس کا فلسفۂ اخلاق کیا ہے، اس کی عبادت کس غرض کے لیے ہیں، وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں، وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لیے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے، اس کے مزاج سے کس قسم کا نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا رہا ہے اور آج کس طرح کرسکتا ہے، اس کے نظام زندگی کو برپا کرنے کے لیے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں۔ مگر اس کام سے ہمارا مقصد محض ایک علمی خدمات انجام دینا نہ تھا بلکہ اول روز سے ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہوں وہ اس کو عملا قائم کرنے کے لیے بھی تیار ہوں جائیں۔ اس لیے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اکسانے کی کوشش بھی کرتے رہے اور امان کی دعوت کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین کرتے رہے کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکتا۔ لہٰذا جو لوگ بھی سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انھیں دنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار ہونا چاہیے۔

ہمارے کام کی ترتیب:

اس مرحلے کے کام کو جو لوگ اچھی طرح سمجھنا چاہیں وو اگر ہماری مطبوعات کو ذیل کی تاریخی ترتیب کے ساتھ مطالعہ فرمائیں تو ان کے سامنے وو پورا نقشہ واضح ہو سکتا ہے جس پر شروع سے ؁۴۱ ء کے اختتام تک کام کیا گیا۔

؁۳۳ ء اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ مسئلہ جبر و قدر۔

؁۳۳ ء۔ ؁۳۸ ء تنقیحات اور تفہیمات حصہ اول و دوم کے بیشتر مضامین۔

؁۳۵ ء حقوق الزوجین۔ اسلام اور ضبطِ ولادت

؁۳۶ ء۔ ؁۳۷ ء رسالۂ دینیات۔ سود۔ پردہ

؁۳۸ ء خطبات

؁۳۹ ء اسلام کا نظریہ سیاسی۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر۔

؁۴۰ ء تجدید و احیاء دین۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ ایک اہم استفتاء۔

؁۴۱ ء قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ اسلام اور جاہلیت۔ نیا نظامِ تعلیم[1]، انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل[2]۔

---

[1] اب یہ مضمون میری کتاب "تعلیمات" میں شامل کر لیا گیا ہے۔

[2] اس فہرست میں "الجہاد فی الاسلام" کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ دعوت کا کام شروع کرنے سے پہلے کی تصنیف ہے۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ "الجہاد فی الاسلام" ہی وہ کتاب ہے جس کی تصنیف کے دوران میں مصنف کو اسلام کے پورے مظام فکر و عمل اور اس کی حقیقی دعوت کو سمجھنے کا موقع ملا اور اسی مطالعہ اور تحقیق نے بال آخر اس تحریک کی راہ ہموار کی۔ متذکرہ بالا تمام کتب اب طبع ہو چکی ہیں اور اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور سے مل سکتی ہیں۔

شاید یہ مرحلہ ابھی کچھ اور دراز ہوتا لیکن اس دوران میں ملک کے سیاسی حالات جو پلٹا کھا رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ بغیر کسی مزید تاخیر کے دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھائیں۔

قومی، جمہوری، لادینی حکومت کی ابتداء

انگریزی حکومت نے انیسویں صدی کے دورِ آخر سے ہندوستان میں جمہوری ادارت قائم کرنے اور باشندگان ملک کو حکومت کے اختیارات میں حصّے دار بنانے کا جو سلسلہ شروع کر کھا تھا اس کی پوری بنیاد جمہوریت کے ان قاعدوں پر مبنی تھی جو انگلستان کے اپنے گھر میں رائج تھے۔ انہوں نے یا سمجھا تھا کے انگلستان کی طرح ہندوستان کے باشندے بھی بلا امتیاز مذہب و ملت ایک قوم ہیں اس لیے یہاں بھی انگلستان کے نمونے پر ایک ایسی جمہوری حکومت بن سکتی ہے جس میں اکثریت کی نمائندے ملک کا انتظام اپنی صوابدید کے مطابق چلائیں اور اقلیت کے نمائندے حزب اختلاف میں رہتے ہوئے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنا مخصوص تمدنی و سیاسی فلسفہ بھی رکھتے تھے جسے انہوں نے اور انکے شاگردوں نے ایک اٹل حیثیت دے رکھی تھی۔ اور وہ یہ تھا کہ مذہب کا تعلق صرف انفرادی عقیدہ و عمل سے ہے، ریاست کو لازماً غیر مذہبی (secular) نظام ہونا چاہیے ۔ یہ نظریات، جن پر ملک کا نظام ڈھالا جا رہا تھا اور جن کے مطابق ہر آئینی ترقی کے ساتھ زیادہ اختیارات اکثریت کی طرف منتقل ہوتے چلے جا رہے تھے، اس قوم کے لیے سراسر مفید تھے جو ہندوستان کی آبادی میں اکثریت رکھتی تھی۔ اس لیے اس نے نہ صرف انہیں قبول کیا بلکہ وہ انکی زبردست حامی اور وکیل بن گئی۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کی پوری تحریک اول روز سے قائم ہی اس بنیاد پر ہوئی تھی کہ انھیں نظریات کے مطابق ملک میں ذمہ دارانہ

حکومت کے قیام کی جدوجہد کرے۔ لیکن مسلمان جن کے لیے اس "قومی، جمہوری، لادینی ریاست" کے نظریہ کا ہر جزو زہرِ قاتل کا حکم رکھتا تھا، مسلسل تذبذب میں مبتلا رہے اور اپنے لیے کوئی صحیح راستہ تجویز نہ کر سکے۔

مسلمانوں کا تذبذب

اول اول انہوں نے کوشش کی کہ حکومت کے اختیارات باشندوں کی طرف منتقل ہی نہ ہوں بلکہ تمام اختیارات انگریز حکومت اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ پھر جب یہ پالیسی چلتی نظر نہ آئی تو انہوں نے واحد قومیت کی بنیاد پر جمہوری حکومت کے اصول کو تسلیم کر لیا اور صرف اسی امر کی کوشش شروع کر دی کو کسی طرح اس نظام میں ان کے لیے ایسے آئینی تحفظات رکھ دے جائیں جن کی پناہ میں وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکیں۔ پھر وہ یکایک تحریک خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے لگے اور اکثریت کے اعتماد پر بالکل اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر "آئینی تحفظات" کے مطالبے کی طرف رجوع کیا اور اس سوال پر رفتہ رفتہ ان کے اندر پھوٹ پڑنی شروع ہو گئی۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہو گیا کہ پہلے اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کر لی جائے پھر "تحفظات" کا سوال چھیڑا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس اسرار پر قائم رہا کہ پہلے "تحفظات" کا معاملہ طے کر لیا جائے پھر حصول آزادی کے لیے اکثریت کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ملت دونوں گروہوں میں سے کسی کو بھی نہ سوجھی کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے گا اس کے اندر کسی گروہ کی جداگانا قومیت باقی نہیں رہ سکتی اور ایک لادینی ریاست میں کسی دینی تہذیب کا نشونما پانا ممکن نہیں ہے۔

واحد ہندی قومیت کے خطرات کی نشاندہی

یہ حالت تھی جب ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بنا اور ۳۷ء میں اس کا وہ ہش ملک میں نافذ ہوا جس کی رو سے صوبوں کو ذمے دارانہ حکومت کے وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ اب یہ صف نظر آرہا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ عارضی دور عنقریب ختم ہونے والا ہے جس میں ایک بیرونی قوم کے مٹھی بھر افراد یھاں حکومت کر رہے تھے اور وہ مستقل دور شروع ہونے والا ہے جس میں واحد قومیت، جمہوریت اور لا دینی کے اصولوں پر اسی ملک کی اکثریت یہاں حکومت کرے گی۔ اس موقع پر ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اس آنے والے دور کے خطرات مسلمانوں کے سامنے صاف صاف کھول کر پیش کر دیں کیوں کہ ہمارے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اس نظام میں کوئی آئینی تحفظ مسلمانوں کو اور ان کی تہذیب کو اکثریت اور اس کی تہذیب میں گم ہونے سے بچا سکے گا اور اس صورت میں ہمارے کے اپنے نصب العین کا حصول اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے گا۔ چناچہ اسی خطرے کو محسوس کر کے ۳۷ء سے ۳۹ء تک مسلسل ترجمان القرآن میں وہ مضامین لکھے جاتے رہے جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصہ اول و دوم اور "مسئلہ قومیت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں[3]۔ ان مضامین میں ہم نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ اگر انہوں نے واحد قومیت کا اصول تسلیم کر کے ایک جمہوری لادینی نظام کے قیام کو قبول کر لیا تو یہ ان کے لیے خودکشی کا ہم معنی ہو گا۔

ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان تین سالوں کے دوران میں مسلمانوں کے اندر کانگیرسی نظریے کا زوال اور اپنی جداگانا قومیت کے احساس کا نشونما جو کچھ بھی ہوا وہ ہماری ان کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مگر اس

---

[3] اب ان کے مجموعہ کو "تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان" کے نام سے طبع کیا گیا ہے۔ (اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور)

بات سے شاید ہمارا کوئی مخالف بھی سچائی ے ساتھ انکار نہیں کر سکتا کہ اس نتیجے کے ظہور میں کچھ ہماری کوششوں کا دخل بھی تھا۔

اسلامی نظریہ حیات کے کے جدوجہد کی دعوت

اس کے بعد مسلمانوں کے لیے یہ نازک سوال حل طلب تھا کہ وہ اس پیچیدگی سے کس طرح نکلیں جس میں ملک کے سیاسی ارتقاء نے ان کو بتلا کر دیا ہے۔ کانگریسی مسلمانوں کا نظریہ اب ان کے لیے قابل قبول نہ رہا تھا۔ یہ بات بھی اب وہ سمجھ چکے تھے کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے گا اس میں کوئی آئینی تحفظ ان کے کم نہیں آسکتا۔ مگر اب اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟ یہ سوال سخت پریشان کن تھا۔ ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ تقسیم ملک کا مطالبہ کیا جائے اور ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کرا لیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو، جن میں ابتداً خود مسٹر جناح مرحوم بھی شامل تھے، اس حل کے قبول کرنے میں اس بناء پر تامل تھا کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلے کو حل کرتا ہے بقیہ آدھی قوم جو ہندوستان کے بڑے حصے میں کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے، بالکل اکثریت کے رحم پر چھوٹ جاتی ہے۔

اس موقع پر ہم نے ؁٣٩ ء میں اوک اور سلسلۂ مضامین شروع کیا جو ؁٤٠ ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصہ سوم[4] کے نام سے شائع ہوا۔

اس میں مسلمانوں کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ آپ جس پیچیدگی میں اپنے آپ کو اس وقت بتلا پا رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے مسلمان کو محض ایک قوم سمجھ لیا ہے اور قوم ہونے کی

---

[4] اب ان کے مجموعہ کو "تحریکِ آزادی ہند اور مسلمان" کے نام سے طبع کیا گیا ہے۔ (اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ، لاہور)

حیثیت سے آپ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت میں آپ کی طاقت کا مدار صرف تعداد پر ہے۔ اس لیے آپ اس دو گونہ مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ اگر ہندوستان ایک رہتا ہے تو آپ کی پوری قوم فنا ہوتی ہے اور اگر تقسیم ہوتا ہے تو آدھی قوم کو قیمت دینا پڑتا ہے۔ لیکن در حقیقت آپ محض ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک اصول اور ایک نظریے کی حامی جماعت ہیں۔ آپ کی حیثیت جرمن، فرنچ اور انگریز کی طرح ایک نسلی قوم کی سی نہیں ہے بلکہ سوشلسٹ، اور کمیونسٹ کی طرح ایک اصولی پارٹی کی سی ہے۔ پچھلی صدیوں میں آپ اپنے اصولوں کی طاقت سے ملک کے ملک جیت چکے ہیں...... خود ہندوستان میں بھی جو کروڑوں مسلمان نظر آتے ہیں وہ انہی اصولوں سے مسخر ہوئے تھے۔ لہذا اگر آپ قومی حقوق اور قومی مفاد کے بجائے اپنے اصول اور اپنے نظریہ حیات کے لیے جدوجہد شروع کر دن تو صرف یہی نہیں کہ ہندوستان میں آپ مٹائے نہ جا سکیں گے بلکہ اس امر کا بھی نہایت قومی امکان ہے کہ چند سال کے اندر پورا ہندوستان دار السلام بن جائے کیونکہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم یا پارٹی کے پاس اتنے جاندار اصول موجود نہیں ہیں جیسے اسلم نے آپ کو دیئے ہیں۔

ہم نے اس خیال کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ پیش کیا اور کوشش کی کہ مسلمان اسے اپنا لیں۔ لیکن قوم کی عظیم اکثریت کو اس نے اپیل نہ کیا۔ ۱۹۴۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اس کو اپنا مطمحِ نظر بنا چکے ہیں۔

دو نہایت اہم اور دردناک سوالات

اب ہمارے سامنے دو نہایت اہم اور دردناک سوال غور طلب تھے، ایک یہ کہ اگر مسلمان تقسیم ملک کے لیے اپنا پورا زور لگا دینے کے بعد خدا نخواستہ اس کوشش میں ناکام ہو جائیں تو اس قومی شکست کے

اثرات ونتائج سے اسلام، اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کی اسلامی انفرادیت کو بچانے کی کیا شکل ہوگی؟ دوسرے یہ کہ اگر ملک تقسیم ہو تو ہندوستان کے بڑے حصے میں جو کروڑوں مسلمان رہ جائیں گے ان کے اندر اسلم کی شمع روشن رکھنے اور اس کے نور کو پھیلانے کی کیا صورت ہوگی؟ اور پاکستانی تحریک کی رہنمائی جس قسم کے لیڈر کر رہے ہیں اگر انہی کی رہنمائی میں پاکستان قائم ہو تو اس کو ٹرکی کی طرح ایک لادینی ریاست بننے سے بچانے اور ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لیے کیا تدبیر کی جا سکتی ہے؟

جماعت اسلامی کی تاسیس

ہمارے نزدیک یہ دو سوالات اس قدر اہم تھے کہ برعظیم میں اسلام کے مستقبل کا انحصار انہی کے صحیح حل پر موقوف تھا۔ ہم نے ان پر مہینوں غور و فکر کیا اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ان تمام لوگوں کو منظم کرنے کا وقت آگیا ہے جو پچھلے ۹ سال میں ہماری دعوت سے متاثر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اگست ٤١ میں ان کو جمع کیا گیا اور "جماعت اسلامی" کی بناء ڈال دی گئی۔ اس تنظیم سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اسی وقت سے ایک ایسے منظم اور تربیت یافتہ گروہ کو تیار کرنا شروع کر دیا جائے جو اس برعظیم میں اسلام کے غلبے کے لیے کام کرنے کے قابل ہو۔ اگر خدانخواستہ مسلمان تقسیم ملک کی جدوجہد میں ناکام ہو جائیں تو یہ گروہ اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود رہے اور اگر ملک تقسیم ہو جائے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یہ گروہ اسلام کا علم بلند کرنے کے لیے تیار رہے۔

اس طرح ہماری یہ دعوت دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

دوسرا مرحلہ

تنظیم و تربیت

تحریکِ اسلامی کے پہلے مرحلے میں کیا کام کس طرح کیا گیا۔ اور پھر دوسرا مرحلہ کس طرح کن حالات میں شروع ہوا اس کی تشریح پچھلے باب میں کی جا چکی ہے، اس بحث کو اگر آپ نے بغور پڑھا ہے تو اس سے دو باتیں آپ پر واضح ہو گئی ہوں گی۔

اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود

ایک یہ کہ اول روز سے ہمارے پیشِ نظر ایک ایسی اجتماعی جدوجہد برپا کرنا تھا جو خالص اصولی حیثیت سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے اور اس دین کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کی سعی کرے۔ ہمارے نزدیک یہی کام اُمتِ مسلمہ کا اصل مقصد وجود تھا اور ہماری تشخیص یہ تھی کہ دنیا کے تمام بگاڑ اور مسلمانوں کے عالمگیر تنزل اور خود برعظیم ہند میں مسلمانوں کی قومی مشکلات کی حقیقی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس اُمت نے وہ کام چھوڑ رکھا ہے جس کے لیے دراصل اس کو پیدا کیا گیا تھا۔ اس غرض کے لیے ہم اپنی کوئی الگ جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہماری خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس چیز کا صحیح احساس پیدا ہو۔ وہ پہلے خود اسلام کو سمجھیں، پھر اس کے بارے میں اپنے فرض کو پہچانیں اور پھر قومی حیثیت سے دوسرے مشاغل کو چھوڑ کر اپنی ساری قوت اور اپنی ساری توجہ اپنے دین کی دعوت اور اقامت پر مرکوز کر دیں۔ ہمیں یقین تھا کہ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے مسلمان اپنی

مشکلات کو بھی دور کر سکتے ہیں اور دنیا کی مشکلات کا بھی صحیح حل پیش کر کے اقوامِ عالم کے امام بن سکتے ہیں۔

جماعت اسلامی کی وجہ تاسیس

دوسری یہ کہ ہم نے جماعت اس وقت بنائی جب ہماری ۹ سال کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے باوجود مسلمانوں کے من حیث القوم اس راہ کو اختیار نہ کیا جسے ہم پیش کر رہے تھے۔ جب مسلمانوں کی تمام موجود الوقت جماعتوں نے اسے اپنی اجتماعی سعی کی راہ بنانے سے احتراز کیا اور جب تقسیمِ ہند مسلمانوں کی قومی پالیسی قرار پا گئی جس کے نتیجے میں لازماً آدھے مسلمان یرغمال کے طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے ہو جانے والے تھے اور بقیہ آدھے مسلمانوں کو ایک ایسی قومی ریاست یسر آنے والی تھی جس کا ایک حقیقی اسلامی ریاست میں تبدیل ہونا (کم از کم اس کے بانیوں اور لیڈروں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے) سخت مشتبہ نظر آتا تھا، ان حالات میں ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے اندر جو مٹھی بھر افراد ایسے موجود ہیں جنہوں نے ہماری دعوت کو سمجھا اور دل سے قبول کیا انھیں لے کر جلدی سے جلدی منظم کر لیا جائے اور ان کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے تاکہ ایک ایسا گروہ تیار ہو جو ایک طرف قومی اغراض سے بالاتر ہو کر خالص اقامتِ دین کی سعی کر سکے اور دوسری طرف ان حالات کا مقابلہ کر سکے جو تقسیمِ ہند کی جدوجہد کے نتیجے میں پیشِ نظر آرہے تھے۔

اس دوسرے مرحلے کو ہم تنظیم و تربیت کا مرحلہ کہتے ہیں۔

مراحل میں تقسیم کا مطلب

تے مگر یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ کسی تحریک کو مراحل میں تقسیم کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک مرحلے کا کام دوسرے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے ختم ہوچکا ہوتا ہے اور پھر بعد کے مراحل میں اسے جاری نہیں رکھا جا سکتا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مرحلے میں پہلے مرحلے کا کام کو جاری رکھتے ہوئے کچھ مزید کام بھی شروع کر دیے جاتے ہیں تشکیل جماعت کے بعد تنظیم و تربیت کے پروگرام کو شروع کرنے کے ساتھ ہم نے تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کے کام کو اسی طرح مسلسل جاری رکھا جس طرح وہ ابتدا سے چلا رہا تھا اس دور میں جو چیزیں شائع کی گئی ان کو بھی اگر ناظرین تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں تو انہیں اس نقشے کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی جس پر ہم اس دعوت کو آگے بڑھا رہے تھے

دوسرے مرحلے کے مطبوعات

؁۴۲ء ؁۴۷ء	رسائل و مسائل کے بیشتر مضامین۔ تفہیم القرآن کا آغاز۔
؁۴۲ء	سلامتی کا راستہ
؁۴۳ء	دین حق، مرتد کی سزا اسلامی قانون میں
؁۴۴ء	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر، حقیقت شرک
؁۴۵ء	حقیقت توحید۔ اشتراکیت اور نظامِ اسلام ۔
؁۴۶ء	شہادتِ حق۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار۔
؁۴۷ء	جماعت اسلامی کی دعوت۔ بناؤ اور بگاڑ۔ حقیقتِ تقویٰ

ان مطبوعات سے یہ بات بخوبی واضح ہو سکتی ہے کہ اس مرحلے میں دین کی بنیادی دعوت اور اس کے عملی نظام کی تشریح و توضیح کا کام پہلے مرحلے سے بھی کچھ زیادہ وسعت کے ساتھ انجام دیا گیا اور ؁۴۷ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسا وسیع لٹریچر اس ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کے لیے فراہم کر دیا گیا جس میں وہ اسلامی نظامِ زندگی کے قریب قریب ہر گوشے کی شکل و صورت قابلِ فہم طریقے سے دیکھ سکتی تھی۔ جماعت کی تنظیم و تربیت کا کام اس پر مستزاد تھا۔ نہ یہ کہ دعوت کو چھوڑ کر اس مرحلے میں صرف جماعت کی تیاری پر ہی سارا وقت صرف کیا گیا ہو۔

جماعت کی تاثیر کا مقصد

اب ہم ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جماعت کی تاسیس کے وقت کیا مقصد ہمارے پیشِ نظر تھا۔ کس قسم کے آدمی ہم تیار کرنا چاہتے تھے اور ان سے کیا کام لینا مطلوب تھا۔ اس غرض کے لیے مناسب معلوم ہوتا کہ آج کوئی نئی تشریح و توضیع کرنے کے بجائے انہی عبارات کو پھر ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے جن میں ابتداً جماعت کے مقصدِ تاسیس کو بیان کیا گیا تھا۔

تشکیلِ جماعت سے چار مہینے قبل اپریل ؁۴۱ء میں ترجمان القرآن میں ایک مضمون لکھا گیا تھا جو ہماری کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم" میں "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کے بعد کہ شرک، رہبانیت اور مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کی ناکامی کے بعد اب دنیا کا مستقبل صرف ایک ہی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ اسلام کا نظریہ ہے، عرض کیا گیا تھا۔

صالح جماعت کے کارکنوں کے اوصاف

"لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے .... دنیا کو آئندہ دور ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریے کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریے پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ اسی طرح دیا جاسکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے چھوڑیں۔ پھر ان کو اس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو جو اس نظام سے وابستہ ہوں چھوڑنا ہو گا اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا۔ اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے۔ اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا ۔ قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیِ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو

جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے ایک صحیح نظریے کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جفاکشی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔"

تشکیل جماعت کے ایک سال بعد اکتوبر ؁۴۳ء میں دربھنگہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی گئی تھی اس کے چند فکرے یہ ہیں:

قائدانہ صلاحیتوں کے حامل کارکن

"ہمارے لئے خارج سے بڑھ کر باطن اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے محض تنظیم اور محض ایک چھوٹے سے ضابطہ بند پروگرام پر لوگوں کو چلانے اور عوام کو کسی دھڑے پر لگا دینے سے ہمارا کام نہیں چلتا۔ ہمیں ایک عوامی تحریک چلانے سے پہلے ایسے آدمی تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر ایسے صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لئے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیب و تمدن کے معمار بھی...... یہ

اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدت مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیشِ نظر کام کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی سربراہی کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کرلی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے .... تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صَرف ہوں۔ ایک ٹھوس اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلے کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ۹۱۔۹۲۔ اشاعت دوم مئی ۱۹۵۸ء)

مارچ سنہ ۴۴ء میں اجتماع دارالاسلام کے موقع پر جو تقریر کی گئی تھی اس کے حسب ذیل فقرے بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:

پہلے اپنی اصلاح

"اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے پر نکلیں، اس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں .... حدیث نبویؐ کے

مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنائیے جو ایک کھونٹے سے باندھا ہوا ہو۔ وہ خواہ کتنا ہی گھومے پھرے بہرحال اس حد سے آگے نہیں جا سکتا جہاں تک اس کی رسی اسے جانے دیتی ہے۔ ایسے گھوڑے کی حالت اس آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے، اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ پس آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

(روداد جماعت اسلامی حصہ دوم۔ ۲۸۔ ۳۰۔ اشاعت چہارم، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

دعوت کا مجسم نمونہ

" آپ بہ حیثیتِ فرد اور بہ حیثیتِ جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دل دادہ اور اپنے اصول و ضوابط کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابند اصولِ زندگی کو گوارا نہ کر سکیں ...... مگر میں بروقت یہ واضح کر دوں کہ یہ ساری کشمکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار نہیں بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔" (ایضاً ۳۱۔ ۳۲)

پتّہ مار کر ٹھوس کام کرنے کی عادت

"ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔ ایک مدتِ دراز سے ہماری قوم اس طریقِ کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے، جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو، چاہے مہینے دو مہینے میں سب کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے۔ اس کی جگہ بتدریج اور بے ہنگامہ کام کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اگر آپ کے سپرد کیا جائے تو بغیر کسی فوری اور نمایاں نتیجے کے بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی میں کھپا دیں۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں ہوا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے۔ ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے اُن چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نگاہوں میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔" (ایضاً ۴۳-۴۴)

دسمبر ؁۴۴ میں اجتماعی لاہور کے موقع پر جو تقریب کی گئی تھی اس کے بھی چند اقتباسات ہمارے مدعا پر اچھی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

یک رنگ مومن مسلم

"ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یکسو ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو، ہر اس چیز سے کٹ جائے (اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے) جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریقِ

زندگی کے منافی ہو اور اچھی طرح مقتضیات ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔ "

(دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات۔ ۲۳-۲۴، اشاعت پنجم ١٩٥٦؁ء)

برتر اوصاف اور صلاحیت کار

"ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمامِ کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے بلکہ ایجابی طور پر ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ ہو، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ ہو، نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح اور پاکیزہ ہو بلکہ اس کے ساتھ اُن تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ دنیا کے موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے اُن اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کردے" (ایضاً۔ صفحہ ٦٢)

صالح گروہ کی تنظیم

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زُہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیا سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کے

کاروبار اُن بُرے لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر آتا بھی ہے تو خلقِ خدا کو دھوکا دینے کے لئے آتا ہے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے بھی آراستہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت اور قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک گروہ کو منظم کر لیا جائے۔ بد اخلاق اور بے اصول لوگوں کے لئے دنیا کی چراگاہ میں بس اُسی وقت تک چرچُگ لینے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا۔ جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست، معیشت، مالیات، علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گا لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی اس بات کا یقین بھی ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔" (ایضاً ۵۲-۵۳)

تقسیمِ ہند سے تین مہینے پہلے مئی ؁۴۷ء میں جماعت اسلامی کا ایک اجتماع ہمارے سابق مرکز میں ہوا تھا۔ اس موقع پر ملک کے عام اخلاقی بگاڑ اور اس کے ہولناک نتائج کا ذکر کرنے کے بعد عرض کیا گیا تھا۔

صالح عنصر کو چھانٹنا اور منظم کرنا

"اس تاریکی میں ہمارے لیے امید کی ایک ہی شعاع ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فیصد لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو اس عام بداخلاقی سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتداء کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔

ہماری بد قسمتی کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو بہت منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے لیکن نیکی منظم نہیں ہے .... یہ حالت اب ختم ہونی چاہیے، اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں، تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اس بڑھتے ہوئے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہو جائیں، اگر ان کا اپنا ذاتی اور اجتماعی رویہ خالص راستی، انصاف، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو اور اگر وہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل، اور دنیا کے معاملات کو درست طریقے پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں، تو یقین جانیے کہ اس منظم نیکی کے مقابلے میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا رہے گی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکا ضرور دیا جا سکتا ہے اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو

مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جا سکتا .... اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو تو لامحالہ علم بردارانِ شرعی کے ہاتھ میں رہے گا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبردارانِ شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخرکار اخلاق کے میدان میں ہوگا اور اس میدان میں نیک انسانوں کو بُرے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلے میں جھوٹ، ایمانداری کے مقابلے میں بے ایمانی اور پاکبازی کے مقابلے میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگائے آخری جیت بہرحال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور بُرے اخلاق کی تلخی کو چکھ لینے کے بعد آخرکار اس کا فیصلہ یہی ہو کہ مٹھاس سے تلخی زیادہ بہتر ہے۔" (بناؤ اور بگاڑ، صفحہ ۳۱-۳۵۔ اشاعت ششم سنہ ۱۹۶۲ء)

یہ طویل اقتباسات جو سب کے سب تشکیل جماعت کے ابتدائی دور کی تحریروں اور تقریروں سے لیے گئے ہیں، اُس مقصد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں جس کے لئے جماعت کی تاسیس اور کارکنوں کی تنظیم و تربیت کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جو حضرات اس کام کو سمجھنا چاہیں وہ ہماری حسب ذیل مطبوعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

سنہ ۳۹ء - سنہ ۴۰ء مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم

سنہ ۴۱ء - سنہ ۴۳ء روداد جماعت اسلامی حصہ اول

سنہ ۴۴ء روداد جماعت اسلامی حصہ دوم

؁۴۵ء دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات۔ تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں۔ روداد جماعت اسلامی حصہ سوم

؁۴۷ء روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم، ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل۔ جماعت اسلامی کی دعوت۔ بناؤ اور بگاڑ۔

ان چیزوں کے مطالعہ سے ناظرین کو نہ صرف یہ معلوم ہو جائے گا کہ تشکیل جماعت سے ہمارا مقصد کیا تھا بلکہ وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اگست ؁۴۱ء سے ؁۴۷ء تک کے پورے چھ سال ہم نے کس کام میں گزارے، ہمارا طریقِ تنظیم کیا تھا، ہم نے اپنی جماعت میں کس قسم کا ڈسپلن قائم کیا تھا، ہم کس طریقے سے آدمیوں کو چھانٹ چھانٹ کر لیتے اور کس طرح ناکارہ اشخاص کو چھانٹ کر الگ کرتے رہے اور مردانِ کار کی تربیت کے لئے کس نوعیت کی تدبیریں ہم نے اختیار کیں اور کیا کچھ کرنا چاہتے تھے جسے عمل میں نہ لا سکے، یہ سب کچھ ان مطبوعات کے آئینے میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک شخص چاہے تو جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس سارے کام پر چند طعن آمیز فقروں سے یا چند جھوٹے الزامات سے پانی پھیر سکتا ہے، لیکن یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے اس دنیا کے نظام کو قائم ہی کچھ ایسے قوانین پر فرما دیا ہے کہ یہ یہاں پھونکوں سے پہاڑ نہیں اڑائے جا سکتے اور الفاظ سے حقیقتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔ اللہ کے ملک میں یہ اندھیر نہیں ہے کہ کسان تو اپنی محنت سے ایک کھیتی تیار کرے اور کوئی شخص محض کوس کوس کر اسے جلا ڈالے۔

طریقِ تنظیم و تربیت

گزشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جا چکا ہے کہ اگست ؁۴۱ء میں تحریکِ اسلامی سے متاثر ہونے والوں کی تنظیم و تربیت کا سلسلہ کس غرض کے لیے شروع ہوا تھا، کس طرح کے لوگوں کو اکٹھا کرنا مطلوب تھا، کس قسم کی تربیت ان کو دینے کی فکر تھی اور کیا کام لینا ان سے پیشِ نظر تھا۔ ان سب امور کی توضیح جماعت کے ابتدائی دور کی مطبوعات کے حوالوں سے کی گئی ہے تاکہ کوئی شخص یہ شبہ نہ کرسکے کہ آج اس جماعت کے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کا مقصد تاسیس نئے سرے سے وضع کیا جا رہا ہے۔

اس مقصد کے لیے معاشرے کے صالح عناصر کو چھانٹنے اور ان کو ایک نظم میں پرونے کا کام ایک نہایت صبر آزما کام تھا جو کئی سال تک خاموشی کے ساتھ اور بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ ہوتا رہا۔ جماعت کا لٹریچر ملک کے بے شمار آدمیوں تک پہنچا۔ ان میں سے لاکھوں نے اپنے اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھا، ان میں سے ہزاروں آدمی کم و بیش اس سے متاثر ہوئے اور ان میں سے سینکڑوں آدمیوں کے دل نے گواہی دی کہ فی الواقع یہی کرنے کا کام ہے مگر یہ سینکڑوں آدمی بھی بیک وقت اس طرح جماعت کے نظم میں داخل نہیں کر دیے گئے کہ انھوں نے کسی رکنیت کے فارم پر دستخط کر دیئے ہوں اور بس وہ رکنِ جماعت قرار پا گئے ہوں۔ وقتاً فوقتاً تھوڑے تھوڑے آدمی یہ فیصلہ کر کے آگے بڑھتے رہے کہ اب ان کا جینا اور مرنا رب العالمین کے لئے ہے۔ ان کے قول کو ان کے عمل کی گواہی سے جانچا اور پرکھا گیا کہ جس فیصلے کا وہ زبان سے اظہار کر رہے ہیں ان کی عملی زندگی بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے یا نہیں۔ بسا اوقات ایک ایک شخص کئی کئی مہینے تک اُمیدواری اور امتحان کی منزل میں رکھا گیا، پھر جب اچھی طرح اطمینان کر کے اسے جماعت میں لیا گیا تو اس کے بعد بھی پوری جماعت یہ دیکھتی رہی کہ اس کے اخلاق، اس کے

معاملات اور خدا کے دین کی سربلندی کے لئے اس کی سرگرمیاں اس کم سے کم معیار کے مطابق ہیں یا نہیں جو دعوت الی الخیر کی خدمت انجام دینے کے لیے مطلوب ہے۔ جہاں کوئی شخص معیار مطلوب سے نیچے اترا، جماعت کے پورے نظم نے اس کو سنبھالنے اور اٹھانے کی کوشش کی مگر جب وہ نہ اٹھ سکا تو اسے جماعت سے الگ کر دینے میں کبھی تامل نہ کیا گیا تاکہ ایک شخص کے کمزوری پوری جماعت کو کمزور نہ کر دے۔ اس طرح چھ سال کی طویل مدت میں ۱۰ کروڑ کی عظیم الشان قوم میں سے جو لوگ اس تنظیم کے لئے چھانٹے جا سکے ان کی تعداد تقسیم ہند کے وقت صرف ٦٢٥ تھی۔ ان لوگوں کو چھانٹنے میں جتنی خدمت جماعت کے لٹریچر نے اور جماعت کے معیار انتخاب نے انجام دی، ملک کے حالات نے بھی اس سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری قوم سخت ہنگامہ خیز حالات میں بتلا تھی، اس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی ہنگامہ پسند، شہرت طلب، جاہ پرست، جوشیلا اور جذباتی آدمی ایسی ایک خاموش اور بے لذت تحریک میں حصہ لینے کا خیال کرتا۔ اس وجہ سے ہماری دعوت کی طرف وہی لوگ کھنچ کر آئے جن کے دلوں میں دین حق کے لیے اخلاص موجود تھا اور جن کے اندر ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا ایک نصب العین طے کرنے اور پھر اس کے لئے مدت العمر خاموشی کے ساتھ لگاتار کام کرتے رہنے کی صلاحیت تھی۔

ہمارا طریقِ تربیت

اس طریقے سے جو لوگ معاشرے میں چھانٹے گئے ان کی تربیت کے لیے ہمیں کوئی خانقاہ یا تربیت گاہ قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اول روز سے ہمارا اعتماد تربیت کے اس فطری طریقے پر رہا جس سے مکے کے ابتدائی مسلمان تیار کیے گئے تھے۔ ان مسلمانوں کے لئے ان کے اپنے گھر اور ان کی اپنی

بستی کے کوچہ و بازار ہی تربیت گاہ تھے۔ زندگی کی آزمائشیں ہی ان کو بنانے اور نکھارنے کے لئے کافی تھیں۔ دعوت حق کو قبول کر کے جب انہوں نے ایک اصول کی پابندی کا فیصلہ کر لیا تو انہیں تربیت دینے کے لئے کسی جنگل یا کھوہ میں لے جانے کی ضرورت پیش نہ آئی، نہ ان کی سیرتوں کی تیاری کے لیے کوئی الگ ادارہ قائم کرنا پڑا۔ وہی معاشرہ جس کے اندر وہ رہتے تھے ان کی زبان سے اصولِ حق کی پابندی کا اعلان سنتے ہی، اور ان کی زندگی میں اس اعلان کا اثر محسوس کرتے ہی ان کو رگڑنے، مانجھنے اور تپا تپا کر پختہ کرنے میں لگ گیا اور اسی تربیت گاہ سے وہ لوگ تیار ہو کر نکلے جو اگرچہ مٹھی بھر تھے مگر انہوں نے چند سال کے اندر عرب کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ٹھیک یہی طریقہ تھا جس کی ہم نے تقلید کی۔ جو شخص بھی جماعت اسلامی میں داخل ہوا اس سے بس یہ عہد لے کر چھوڑ دیا گیا کہ اب وہ اللہ رب العالمین کا مطیعِ فرمان اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا پیرو بن کر رہے گا اور اس مقصد کے لیے کام کرے گا کہ اللہ اور رسولؐ کا دین دنیا میں غالب ہو کر رہے۔ اس کے بعد جو جس ماحول میں تھا وہیں اس کے لئے ایک ہمہ گیر اور ہمہ وقت تربیت گاہ کھل گئی۔ اگرچہ وہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہا تھا جس میں کسی کو بھی اللہ کی الوہیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار نہ تھا اور کوئی بھی یہ کہنے کے لیے تیار نہ تھا کہ اسلام کے بجائے کفر دنیا میں غالب ہو۔ لیکن بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس معاشرے میں کوئی جگہ ایسی سازگار میسر نہ آئی جہاں اللہ کی عملی اطاعت اور نبئ برحق کی پیروی اور جاہلیت کے طریقوں پر اسلامی طریقوں کی عملی ترجیح بخوشی برداشت کر لی گئی ہو۔ یہ روش اختیار کرتے ہی ہر شخص کو ہر جگہ ایک کشمکش سے سابقہ پیش آیا جس کی ابتدا اس کے اپنے نفس سے ہوئی اور اس کا دائرہ ان تمام گوشوں تک پھیلتا چلا گیا جہاں اس کی اس نئی روش کا اس بگڑی ہوئی سوسائٹی کے طور طریقوں سے تصادم ہوتا تھا۔ جو لوگ اپنی سیرت کے جس گوشے میں بھی خامی رکھتے تھے وہ اسی گوشے میں شکست کھا گئے اور اس کشمکش میں ان کو آپ ہی آپ چھانٹ کر الگ پھینک دیا۔ مگر جو رَبُّنَا اللہ کہہ کر اپنے اس قول

پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے ان کے لیے یہی کشمکش تو ایک بہترین مربی اور مزکی ثابت ہوئی۔ اس نے اُن کو صبر کی، تحمل کی، ایثار اور قربانی کی مشق کرائی۔ اس نے ان کو دھن کا پکّا اور ارادے میں پختہ بنایا۔ اس نے ان میں اپنے نصب العین سے عشق اور اس کے لیے جدوجہد کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نے ان کو جذبات اور خواہشات پر قابو پانا سکھایا۔ اس نے ان کو اس قابل بنایا کہ جس چیز کو حق سمجھیں اس کے لیے کسی خارجی دباؤ یا لالچ کے بغیر اپنے ایمان کے تقاضے سے اپنا وقت، اپنی محنتیں اور اپنے اوقات صرف کریں۔ اور اسی نے ان میں یہ طاقت پیدا کی کہ اپنے مقصد کی راہ میں نقصانات اٹھائیں، خطرات سہیں، مشکلات کا مقابلہ کریں اور بعد کے مراحل کی شدید تر آزمائشوں کا سامنا کر سکیں۔

تربیت کے اس فطری کورس کی مدد پر تین چیزیں اور تھیں جو اُن کی کسر پوری کرنے والی تھی تھیں۔
ایک دعوت و تبلیغ، دوسرے نظمِ جماعت اور تیسرے روحِ تنقید

دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ آدمی دوسروں کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے جو اس کی عاقبت کے لئے مفید ہے، بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی اپنی اصلاح بھی ساتھ ساتھ ہوتی جاتی ہے۔ جو شخص کسی چیز کو حق مان کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جاتا ہے اور صرف اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے پر قانع ہو جاتا ہے اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو ایک سرمایہ لے کر گھر بیٹھ جائے اور اسی پر گزر بسر کرتا رہے۔ ایسے شخص کا سرمایہ صرف یہی نہیں کہ بڑھتا نہیں ہے بلکہ کام میں نہ لگنے کی وجہ سے الٹا گھٹتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے جو شخص حق بات کو پا کر اسے پھیلانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اس کی مثال اس تاجر کی سی

ہے جو اپنے سرمائے کو کاروبار میں لگا دے۔ اس طرح وہ دوسرے بہت سے لوگوں کی رزق رسانی کا موجب بنتا ہے اور اس کا اپنا سرمایہ بھی یوماً فیوماً بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تبلیغِ حق کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس میں مشغول ہو اس کی اپنی ذات پر وہ حق خود بخود طاری ہوتا چلا جاتا ہے جس کی تبلیغ میں سرگرم ہوتا ہے۔ اس کا چرچا کرنے، اس کی اشاعت کی راہیں تلاش کرنے، اس کی تائید میں دلائل ڈھونڈنے اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کی فکر جتنی زیادہ اس کو لاحق ہوتی ہے اسی قدر زیادہ مستغرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی خاطر جب وہ طرح طرح کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرتا ہے، گالیاں سنتا ہے، طعنے سہتا ہے، الزامات اور اعتراضات برداشت کرتا ہے، اور بسا اوقات چوٹیں کھاتا اور ستایا جاتا ہے تو یہ ساری تکلیفیں حق کے ساتھ اس کے عشق کو اور زیادہ بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ پھر یہ تبلیغ اس کی تکمیل میں ایک اور طرح سے بھی مددگار ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا ہے کی اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دے دو، اپنی زندگی سے تضاد اور منافقت کو دور کرو اور جاہلیت کے ایک ایک اثر کو اپنے اندر سے نکالو، تو اس کے گرد و پیش کی دنیا میں سے سینکڑوں نگاہیں خوردبین لگا لگا کر اس کی اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں اور اس کی کوئی خامی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی نشاندہی کرنے سے زبانیں چوک جائیں اس طرح ایک آدمی کو مانجھنے اور صاف کرنے میں بہت سے بندگانِ خدا، دانستہ یا نا دانستہ لگ جاتے ہیں جو اپنے معترضین کی اس خدمتِ بےمزد سے فائدہ اٹھاتا ہے اس کی تکمیل آپ سے آپ ہوتی چلی جاتی ہے اور جو اس تنقیدِ عام سے شکست کھا کر بھاگ نکلتا ہے وہ خود ہی ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے کام کا آدمی نہیں ہے۔

نظمِ جماعت

نظم جماعت کے لیے ہم نے اول روز سے جو بات لوگوں کے ذہن نشین کی وہ یہ تھی کہ اس جماعت میں وہی شخص داخل ہو جو اس کو جانچ پرکھ کر پہلے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لے کہ یہ جماعت فی الواقع اقامتِ دین کے لئے قائم ہوئی اور اس کی دعوت، طریقِ کار اور اصولِ تنظیم وہی ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت کے ہونے چاہئیں۔ پھر جب اس معاملے میں پوری طرح مطمئن ہو جانے کے بعد وہ جماعت میں آئے تو اسے ٹھیک اسی سمع و طاعت فی المعروف کا التزام کرنا چاہیے جس کا حکم قرآن اور حدیث میں دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جماعت کے ڈسپلن کو توڑنا محض یہی معنی نہیں رکھتا کہ آدمی نے ایک پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے خود اپنے عقیدے میں جس کام کو خدا کا کام سمجھا تھا اس کو جان بوجھ کر خراب کیا اور قصداً خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کی۔

جماعت اسلامی نے اس قاعدے کی پابندی سے پہلا فائدہ تو یہ اٹھایا کہ اس میں ایسے لوگ بہت کم داخل ہو سکے جو اس کے برحق ہونے پر مطمئن نہ ہوں اور محض کسی دماغی لہر کی وجہ سے، یا عارضی کشش کے باعث جماعت کی طرف مائل ہو گئے ہوں۔ اور دوسرا فائدہ یہ اٹھایا کہ جو لوگ بھی جماعت میں آئے وہ ڈسپلن کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کے محتاج نہ تھے۔ انہوں نے زیادہ تر خود اپنے ایمان کے تقاضے سے ڈسپلن کو قبول کیا اور انہیں باقاعدگی، نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنانے میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہیں آئی۔ اب اگر ہمارا ڈسپلن ایک اسلامی جماعت کے معیار مطلوب سے کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ایمان اس درجے کا نہیں ہے جیسا صحابہ کرامؓ کا ایمان تھا۔ لیکن اس لحاظ سے اپنی ساری خامیوں کے باوجود ہم بلا شائبہ مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی اپنے نظم و ضبط اور اپنے

کارکنوں کی باقاعدگی کے اعتبار سے اس ملک کی دوسری تمام جماعتوں کے مقابلے میں نمایاں امتیاز رکھتی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو اب جماعت کے مخالفین بھی ماننے پر مجبور ہیں۔

روحِ تنقید

جماعت کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح اور اس کے کارکنوں کی تربیت اور تکمیل کے لیے تیسری اہم چیز جس سے ہم نے مدد لی وہ یہ تھی کہ اول روز سے ہم نے جماعت کے اندر روحِ تنقید کو بیدار رکھنے کی کوشش کی۔ تنقید ہی وہ چیز ہے جو ہر خرابی کی بروقت نشان دہی کرتی اور اس کی اصلاح کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادی حیثیت سے صفائی کی اہمیت ہے۔ جس طرح نجاست و طہارت کی حس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہو جانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا ہو جاتا ہے اور اس کی فضا ہر طرح کے امراض کے لیے سازگار بن جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اس حقیقت سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ہم نے عام انسانیت کی، اپنی ملت کی خرابیوں پر تنقید کرنے میں جو آزادی برتی، اُسی آزادیٔ تنقید کو اپنی جماعت میں بھی برقرار رکھا تاکہ جماعت کے اندر جہاں جو خرابی بھی موجود ہو اس کی بروقت نشان دہی ہو جائے اور اسے دور کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ جماعت کے ہر شخص کو محض تنقید کا حق ہی حاصل نہیں ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ کسی خرابی کو محسوس کر کے خاموش نہ رہ جائے۔ یہ بات ہر رکنِ جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل ہے کہ اپنے ساتھی ارکان کی ذات میں، یا ان کے جماعتی کردار میں، یا اپنی جماعت کے نظم میں، یا جماعت کے

لیڈروں میں اگر وہ کوئی نقص پائے تو اسے بلا تکلف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی بنایا گیا ہے کہ وہ نہ صرف تنقید کو برداشت کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور جس کی نشان دہی کی گئی ہے وہ اگر واقعی موجود ہو تو اُسے دور کرنے کی طرف توجہ دیں ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کر دیں۔ اس معاملے میں تنقید کے جائز حدود اور معقول طریقے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بسا اوقات غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور ان کا کچھ نہ کچھ نقصان بھی ہمیں اٹھانا پڑا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم نے کبھی جماعت میں روح تنقید کو خوابیدہ ہونے نہ دیا۔ اور اسی کا یہ فائدہ ہے کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کی تربیت اور تکمیل میں مدد دے رہا ہے اور اپنی تکمیل و تربیت میں اس سے مدد پا رہا ہے۔

تیسرا مرحلہ

توسیع اور عملی اقدام

تحریک اسلامی کے دوسرے مرحلے میں جماعت کی تنظیم اور تربیت جس طرز پر کی گئی اسے ہم پچھلے صفحات میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ابھی یہ مرحلہ کچھ اور دراز ہوتا اور ہمیں اپنے نظم کو پختہ اور اپنے کارکنوں کی تربیت کو مکمل کرنے کا پورا موقع مل جاتا۔ لیکن اگست ؁٤٧ء میں تشکیل ٹھیک چھ سال بعد وہ قیامت نظیر انقلاب رونما ہو گیا جس کی آمد کے آثار دیکھ کر ہی ہمیں پہلے مرحلے کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر اگست ؁٤١ء میں دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھا دینا پڑا تھا۔ اس قیامتِ صُغریٰ نے ہمارے کام اور نظام پر دو حیثیتوں سے زبردست اثر ڈالا۔

انقلاب ۴۷ء کے اثرات

پہلا اثر تقسیم جماعت

اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ملک کی سیاسی تقسیم نے جماعتِ اسلامی کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے حالات اور مسائل اچانک ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو گئے کہ دونوں ملکوں میں ایک نظم، ایک پالیسی اور ایک رہنمائی کے تحت کم کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ اگرچہ ان حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہمیں تقسیم سے پہلے بھی تھا، چنانچہ اپریل ٤٧ء کی تقریر مدراس میں اس طرف اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ تقسیم کے بعد، دونوں ملکوں میں ایک نظامِ جماعت قائم نہ رہ سکے گا۔ لیکن جب

تقسیم فی الواقع رونما ہوئی تو ہمیں اپنے اندیشوں سے بھی کہیں زیادہ سخت حالات سے سابقہ پیش آیا اور رسائی کے ذرائع بحال ہوتے ہی پہلی فرصت میں ہم کو مسلم لیگ کی طرح یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ دونوں ملکوں کے نظام جماعت قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیے جائیں۔ یہ فیصلہ فروری ۴۸ میں ہوا اور اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی ہر چیز، عقیدے اور مقصد کے، جماعت اسلامی ہندوستان سے الگ ہو کر رہ گئی۔[5]

دوسرا اثر اس سیاسی انقلاب کا یہ ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو یک لخت توسیع اور عملی اقدام کے مرحلے میں داخل ہو جانا پڑا حالانکہ نظم اور تربیت دونوں کے لحاظ سے ابھی ہمیں اپنی تکمیل کے لیے بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ اس فوری پیش قدمی کا فیصلہ جن وجوہ سے کیا گیا انہیں اسی زمانہ میں جماعت کے ان اجتماعات میں بیان کر دیا گیا تھا جو مارچ و اپریل ؁۴۸ء میں ہوئے تھے۔

مختصراً وہ وجوہ یہ تھے:

انقلاب ؁۱۹۴۷ء اور مسلمانانِ ہند کی حالت

۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں محض ایک مصنوعی انقلاب تھا۔ یعنی وہ کسی ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب کے نتیجے میں رونما نہیں ہوا تھا، بلکہ زیادہ تر خارجی حالات کے تغیر اور دباؤ کے اثر سے واقع ہو گیا تھا۔ اس کی پشت پر اگر کسی تعمیری قوت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے تو وہ حد سے حد بس یہ ہے کہ ایک طرف انگریزی درس گاہوں اور محکموں کی تعلیم و تربیت سے مسلمانوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تیار ہو چکی تھی جو ایک آزاد حکومت کو نظام کا بار، بُرا یا بھلا، کسی نہ طرح اٹھا سکتے تھے۔ اور دوسری طرف

---

[5] اس جگہ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ دونوں جماعتوں کی علیحدگی کے وقت جو ارکانِ جماعت پاکستان میں مقیم تھے یا ہجرت کر کے آ چلے تھے ان کی تعداد ۳۵۸ اور جو ارکان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی تعداد ۲۴۰ تھی۔

مسلمانوں میں اپنی ایک آزاد حکومت قائم کرنے کی خواہش پوری طرح ابھر آئی تھے جس نے خواص سے گزر کر عوام تک کو متحرک بنا دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک حقیقی اور پختہ اور نتیجہ خیز سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کے سامنے اُس نظامِ زندگی کا ایک واضح تصور موجود ہوتا جس پر انہیں آزادی کے بعد اپنی حیاتِ قومی کا قصر تعمیر کرنا تھا اور اس تصور کے بارے میں ذہنی حیثیت سے وہ فی الجملہ یکسو ہوتے۔ کسی انتشارِ فکر اور پراگندگیٔ خیال اور اختلافِ مقاصد میں بتلانہ ہوتے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمان اخلاقی حیثیت سے ایک حد تک صالح اور بالغ ہو چکے ہوتے کہ آزاد ہو جانے کے بعد وہ حکومت خود اختیاری کی ذمہ داریاں بہ آسانی اٹھا سکتے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں میں صبر، ضبط، نظم، باقاعدگی، محنت، تعاون، مواساۃ، امانت، فرض شناسی، احساسِ ذمہ داری، حدود کی نگہداشت اور وحدت و اخوت کے وہ اوصاف موجود ہوتے جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

ان چیزوں کی کمی ہم اسی وقت محسوس کر رہے تھے جب مسلمانوں میں اپنی مستقل حکومت کی خواہش ابھی نئی نئی ابھر رہی تھی۔ ہم نی اس کمی کی طرف ان لیڈروں کی توجہ دلائی جم کے ہاتھ میں مسلمان اپنی زمامِ کار دے رہے تھے مگر انہوں نے صدائے بے ہنگام سمجھا۔ ہم نے خود اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہمیں الٹا دشمن سمجھا گیا۔ اور مسلمانوں کو ہم سے بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ اس حد پر بھی معاملہ رکا نہ رہا بلکہ دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب، اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے۔ مختلف خیالات، عقائد، نظریات اور اغراض اور مقاصد رکھنے والے عناصر کو جمع کر لیا گیا جو اسلام کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے مسلمانوں کا رہا سہا اسلامی تصور بھی دھندلا ہو گیا اور عین پاکستان بننے کے وقت بھی وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ وہ کونسا اسلام

ہو گا جس پر یہ نئی ریاست تعمیر کی جائے گی۔ ہم نے اس پراگندہ خیالی پر بار بار ٹوکا مگر جواب میں الٹا اس بات پر فخر کیا گیا کہ ہم نے قوم کے سارے مختلف عناصر کو جمع کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہ عناصر ایک منفی جنگ کے لیے تو اکٹھے ہو سکتے تھے مگر ایک ایجابی تعمیر کا مرحلہ آتے ہی ان کا منتشر اور متصادم ہے جانا بادی النظر ہی میں یقینی تھا۔ ایسا ہی معاملہ اخلاقی اور اجتماعی حالت کا بھی تھا۔ قومی تحریک جس انداز پر چلی جا رہی تھی اس نے مسلمانوں کو اپنی جگہ پر بھی نہ ٹھیرنے دیا کجا کہ انہیں کچھ اوپر اٹھایا جاتا۔ بدترین سیرت و اخلاق کے لوگ صحافت و قیادت پر قابض ہو گئے۔ ہر میدان میں غیر مسلموں سے مسابقت شروع ہو گئی۔ ہر برائی کا جواب کارِ ثواب سمجھ کر برائی سے دیا جانے لگا یہاں تک کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کی ضد میں گرتے گرتے اسفل سافلین تک پہنچ گئیں۔

یہ سارے حالات ہمارے سامنے گزر رہے تھے اور ان کے نتائج کو ہم خوب جانتے تھے۔ اس لیے جس روز تقسیمِ ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بُری یا بھلی تعمیری سعی بھی آج تک ہم کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنا ہو گا اور اس قوم کو سمبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یک لخت با اختیار ہو گئی ہے۔ اس فوری اقدام کی ضرورت کا احساس ان حالات کو دیکھ کر اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جو عین تقسیم کے وقت اور اس کے معاً بعد پیش آئے۔ ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کا خروج جس شان سے ہوا، پاکستان سے غیر مسلموں کی نکاسی جس طرح عمل میں آئی، غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی دولت کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اور مسلمان مہاجرین پاکستان میں جن حالات سے دوچار ہوئے۔ یہ سب کچھ ایک ایسا آئینہ تھا، جس میں پوری قوم کی، اس کے عوام اور خواص کی، اس کے لیڈروں اور پیشواوں کی، اس کے حکام اور عمال، اس کے اہلِ دین اور اہلِ دنیا کی، غرض سب ہی کی اخلاقی اور اجتماعی تصویر بالکل برہنہ نظر آ گئی۔ پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے ملک کے آئندہ

نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام کرنے میں لگے رہنے کا نہیں ہے، اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس نئی مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالات کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے۔

جماعت کی آزمائش

خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

پہلی آزمائش

ان میں سے پہلی آزمائش ان لوگوں کو پیش آئی جو مشرقی پنجاب کے ہنگامہ قیادت سے گزر کر پاکستان پہنچے تھے۔ ہم نے فرداً فرداً ان کے حالات کا تفحص کیا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ صرف ارکان جماعت ہی نہیں، جماعت کے ہمدرد اور متاثرین تک ہمت و جرّت اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دے کر آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی لیگ کے لیڈروں کی طرح بھاگنے والوں میں سب سے آگے نہ تھا۔ کسی نے بزدلی نہیں دکھائی۔ کسی نے خود غرضی سے کام نہیں لیا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خطرے اور مصیبت

میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہا۔ ہر ایک نے اپنی استطاعت کے حد تک مظلوم مسلمانوں کو بچانے، سنبھالنے اور منظّم طریقے سے نکالنے کی کوشش کی۔ بہت سوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کام کیا اور اکثر و بیشتر اپنے علاقوں سے اس وقت نکلے جب وہ مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔

دوسری آزمائش

دوسری آزمائش مغربی پاکستان میں پیش آئی جہاں سے غیر مسلم نکل رہے تھے۔ یہاں بھی ہم نے پوری دقت نظر کے ساتھ جماعت کے رویئے کا جائزہ لیا اور یہ معلوم کر کے ہمیں اطمینان ہوا کہ جماعت کے ارکان ہی نہیں، ہمدردوں اور متاثرین تک میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے کشت و خون یہ لوٹ مار میں کوئی حصّہ نہ لیا ہو۔ بعض مقامات پر تو پوری پوری بستیوں میں اگر لوٹ سے بچنے والے کچھ لوگ پائے گئے تو وہ صرف وہی لوگ تھے جنہوں نے جماعت اسلامی کا اثر قبول کیا تھا۔ متعدد مقامات پر جماعت کے لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی غیر مسلموں کو پناہ دینے میں تامل نہ کیا۔ اور کوئی ایک اطلاع بھی ہمیں ایسی نہیں ملی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا دامن کسی غیر مسلم عورت کی آبرو ریزی سے آلودہ ہوا ہو حالانکہ اس کے مواقع کی اس وقت کمی نہ تھی۔

تیسری آزمائش

تیسری آزمائش اس وقت پیش آئی جب جماعت کے کارکنوں کو پناہ گزینوں کے کیمپوں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس آخری آزمائش نے ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا کہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود جماعت اسلامی کے پاس اس وقت مردانِ کار کا ایک گروہ تیار ہے جس کے اخلاق اور نظم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ لاہور، کراچی، پشاور، سیالکوٹ، سرگودھا، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں مجموعی طور پر

جماعت کے تقریباً سات سو ارکان اور ہمدردوں نے پناہ گزینوں کی خدمت کا کام کیا۔ ان کارکنوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جو خود پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے اور ابھی کہیں جمنے بھی نہ پائے تھے۔ پھر بھی وہ خدمت کی پکار پر لبیک کہنے سے باز نہ رہے۔ ان لوگوں نے ایثار، جفاشی، ہمدردی، دیانت، امانت، عفت اور نظم و ضبط کا پورا امتحان دیا اور نتیجے میں کم از کم جو چیز ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ان اوصاف میں نہ حکومت کے اعمال ان سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ قومی جماعتوں کے کارکن۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے سات سو آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ناقابلِ اعتماد ثابت ہوا ہو اور جہاں تک نظم کا تعلق ہے دو تین خفیف شکایتوں سے زائد کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی۔ یہ تھا وہ سرمایہ جسے لے کر ہم تیسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔

پہلا قدم۔ اسلامی ریاست کا واضح تصور پیش کرنا

اس مرحلے میں ہمارا پہلا قدم یہ تھا کہ براہ راست عوام تک پہنچ کر ان کے سامنے اس اسلامی ریاست کے تصور کو ایک صاف اور متعین صورت میں پیش کریں جس کے صرف نعرے ہی نعرے انہوں نے سنے تھے اور جس کے فہم کے معاملے میں ان کے لیڈروں نے ان کے ذہن کو الجھانے کے سوا کوئی دوسری خدمت اس وقت تک انجام نہ دی تھی۔ یہ کام جنوری ۴۸ء میں شروع کیا گیا اور شائد ہم بلا شائبہ مبالغہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قریبی دور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شہری اور دیہاتی عوام کو وسیع پیمانے پر اسلامی نظامِ زندگی کے ایک جامع اور واضح تصور سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس کام کے لیے صرف لٹریچر کی اشاعت اور مجلسی ملاقاتوں ہی پر اکتفا نہ کیا گیا، جیسا کہ جماعت اسلامی کا سابق طریقِ کار تھا، بلکہ جماعت کا ہر وہ رکن جو ذمہ دارانہ طریقے سے بول سکتا تھا، تقریر کا مجاز کر دیا گیا۔ اور پاکستان کے گوشے

گوشے میں جلسے کر کے عوام کو یہ بتایا گیا کہ آزاد ہو جانے کے بعد اب مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اسلام جس کے تم معتقد نہیں عاشق بھی ہو، تمہیں کیا نظامِ زندگی دیتا ہے اور اسلامی ریاست فی الواقع کس قسم کی ریاست ہے جس کے قیام کی خاطر تم نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے ساتھ ملک کے کارفرما اور اہلِ دماغ طبقے کو بھی خطاب کیا گیا اور ان کو نہ صرف علمی حیثیت سے یہ بتایا گیا کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کے خد و خال کیا ہیں بلکہ عملی حیثیت سے اس کو وجود میں لانے کی تدابیر بھی پیش کی گئیں اور ہر اس حجت کو قطع کرنے کی کوشش کی گئی جو اس کے خلاف عذر کے طور پر سامنے لائی جا سکتی تھی۔ اس غرض کے لیے ۴۸ء میں جو چیزیں شائع کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کا نظامِ حیات
۲۔ اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی علمی تدابیر
۳۔ اسلامی ریاست کے ذمیوں کے حقوق
۴۔ آزادی کے اسلامی تقاضے
۵۔ مطالبۂ نظامِ اسلامی

دوسرا قدم، اسلامی ریاست کا چہار نکاتی فارمولا

دوسرا قدم جو پہلے قدم کے ساتھ ہی اٹھا دیا گیا، یہ تھا کہ عوام کے سامنے اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کا ایک چہار نکاتی، جامع اور مختصر فارمولہ پیش کیا گیا[6] اور رائے عام کو اس کے حق میں اس حد تک ہموار اور منظم کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک قومی مطالبے کی حیثیت اختیار کر لے اور ملک کی دستور ساز

---

[6] یہ فارمولہ سب سے پہلے اس تقریر میں پیش کیا گیا تھا جو ۱۹/ فروری ۱۹۴۸ء کو لاء کالج لاہور میں کی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو "اسلامی قانون" ص ۳۸ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور

اسمبلی اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قدم فوری طور پر اٹھا دینا اس لیے ضروری تھا کہ ملک کے سربراہِ کار صحیح طور پر ایک غیر دینی (سیکولر) ریاست کے نظریے کی طرف مائل تھے اور اس کے اعلان سے صرف ایک جھجک ان کو روکے ہوئے تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت ذرا سی غفلت برتی گئی تو یہ موقع پاتے ہی آئینی طور پر ایک غیر اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دیں گے اور پھر اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا اس قدر دشوار ہو گا کہ جو کچھ آج تھوڑی سی قربانیوں سے ہو سکتا ہے وہ ہزاروں آدمیوں کے پھانسی پر لٹکنے سے بھی بمشکل ہی ہو سکے گا۔

جماعت کے راہنماؤں کی گرفتاریاں

اس مہم کی ابتدا فروری ۴۸ء میں کی گئی اور چند مہینوں کے اندر اندر ہمارا مرتب کردہ مطالبہ، پاکستان کی پوری مسلم قوم کا متفقہ مطالبہ بن گیا۔ برسر اقتدار گروہ اس مطالبے کا نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اس کڑوی گولی کو حلق سے اتارنے کے لیے تیار تھا۔ کچھ مدت تک وہ عالمِ حیرت میں اس پھیلتی ہوئی آگ کو دیکھتا رہا پھر اس نے ویسی ہی ایک چال چلی جیسی بزدل اور پست اخلاق لوگ ہمیشہ سے چلتے آرہے ہیں۔ وہ چال یہ تھی کہ ایک پوری بنی ہوئی سازش سے راقم الحروف پر زبردستی یہ الزام چسپاں کیا گیا کہ وہ "جہاد کشمیر کو حرام" کہتا ہے اور جن لوگوں نے وہاں لڑ کر جان دی ہے ان کی موت کو "حرام موت" قرار دیتا ہے۔ اس الزام کو پوری قوت کے ساتھ اخباروں اور اشتہاروں اور سرکاری مولویوں کے ذریعے سے پھیلایا گیا۔ نت نئے جھوٹ پوری بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ تصنیف کر کے میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف پھیلائے گئے۔ اس جھوٹ کو فروغ دینے کے لیے جماعت اسلامی کے اخبارات کو بند کر دیا گیا تاکہ کوئی تردیدی بیان پبلک تک نہ پہنچ سکے۔ اور اس طرح چند مہینے تک فضا کو خوب ہموار کر لینے کے بعد اکتوبر

؁۴۸ء میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا .... اس سازش کی شرمناک داستان پوری تفصیل کے ساتھ جماعت کے شائع کردہ پمفلٹ "مودودی کی نظر بندی کیوں؟" میں بیان کی جا چکی ہے...... بظاہر یہ بڑی ہی زبردست چال تھی۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ اس کے زور سے پہاڑ تک ٹل جائیں گے مگر تھوڑی ہی مدت بعد ثابت ہو گیا کہ شیطان کا مکر بہت ضعیف ہے۔ سال ختم ہوتے ہوتے مسلمانوں کی رائے عام پوری طرح اس مطالبہ حق پر متفق ہو گئی جو آغاز سال میں پیش کیا گیا تھا، اور مارچ ؁۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کو طوعاً و کرہاً قرارداد مقاصد پاس کرنی پڑی۔

جماعت اسلامی کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مطالبے کی یہ مہم سراسر اس کی طاقت سے کامیاب ہوئی ہے۔ بلاشبہ ملک کی تمام اسلامی جماعتوں اور تمام دین پسند عناصر کی قوت اس میں شریک تھی اور اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ تھا جو نہ اس وقت جماعت کے دوست تھے نہ آج ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہی اس کی اصل محرک تھی اور اگر یہ منظم طاقت اس کی پشت پر نہ ہوتی تو ان منتشر آوازوں سے جو وقتاً فوقتاً اس نظام کے حق میں اٹھتی رہتی تھیں اس مطالبے کا ایک باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرنا اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے اس مہم کے سلسلے میں کچھ کام کیا ہے اور وہ بس سر اقتدار گروہ بھی جانتا ہے جسے اس جے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔

قرارداد مقاصد اور اس کے اثرات

جو لوگ سیاسی معاملات کا فہم نہیں رکھتے وہ شاید آج تک بھی یہ اندازہ نہیں کر سکے ہیں کہ یہ کس قدر اہم اور ضروری قدم تھا جو جماعت نے اٹھایا اور کس قدر بر وقت اٹھایا۔ آج اس کی اہمیت اور اس کے

دُور رس نتائج ہم بیان بھی کریں تو وہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہم اس میں ناکام ہو گئے ہوتے اور یہاں آئینی طور پر لادینی اصولوں کو ریاست کی بنیاد بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو بھائیوں کو معلوم ہو جاتا یہاں اسلام کے علم برداروں کا مستقبل کیسا خطرناک ہے۔ اب یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ کم ازکم اس نوزائیدہ ریاست کا دستوری نصب العین تو اسلام کے عین مطابق بن چکا ہے اور آئینی حیثیت سے کفر کے مقابلے میں اسلام کی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے۔ اس پر مزید فضل یہ ہے کہ رائے عام پوری طرح اس آئینی پوزیشن کی حمایت پر کمربستہ ہے اور اس کو کسی فریب سے بدل ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہا ہے۔[7]

قرارداد مقاصد کے پاس ہونے کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلم قوم اور پاکستانی مملکت کا نصب العین واضح صورت میں متعین ہو گیا اور اس نے ایک پختہ آئینی شکل اختیار کرلی جس کا بدلنا اب ممکن نہیں رہا ہے، بلکہ اس کا دوسرا اور اس سے بھی زیادہ اہم فائدے کی اہمیت بھی وہ لوگ ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں جنہیں آئینی مسائل کا فہم حاصل نہیں ہے اور اسی بناء پر ان کی سمجھ میں اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس مملکت کی حیثیت میں اس قرارداد کی بدولت کیا بنیادی فرق واقع ہو گیا ہے۔ لیکن ہم نے چونکہ تمام آئینی و شرعی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد خوب سوچ سمجھ کر یہ سوال اٹھایا تھا۔ اس لیے ہم پر اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج ہی نہیں، قانونی اور شرعی نتایج بھی پوری طرح روشن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہوتے ہی جماعت اسلامی نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور اپنے دستور، پالیسی اور طریقِ کار میں اس تغیر کا اعلان کر دیا جو مملکت کی آئینی حیثیت کے تغیر سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔

---

[7] ١٩٥٨ء میں مارشل لاء کے دوران سابقہ آئین منسوخ کر کے ملک کے نام میں سے "اسلامی جمہوریت" کا لفظ نکال دیا گیا۔ لیکن ٦٣ء میں بر سر اقتدار گروہ نے مجبور ہو کر دوبارہ اس نام کو اختیار کیا۔

یہ معاملہ چونکہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس نے ہماری تحریک کے راستے کو اصولاً اور عملاً بالکل بدل دیا ہے اس لیے ہم اس کی تھوڑی سی توضیع کریں گے تاکہ سمجھ بوجھ رکھنے والے اصحاب اس کو اور ہماری تحریک کی رفتارِ مابعد کو اچھی طرح جان لیں۔

اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کا فرق

جس ریاست کا دستور تحریری شکل میں مدوّن نہ اس کے اسلام و کفر کو متعین کرنے کا سوال تو ذرا پیچیدہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی ریاست کا معاملہ بالکل صاف ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا دستور خود اس امر کی شہادت دے دیتا ہے کہ وہ ایک مسلم ریاست ہے یا کفر ریاست۔ اگر کسی ریاست کا دستور صریح طور پر اپنے کفر کی گواہی دے رہا ہو تو اس کے کارپردازوں اور کار فرماؤں میں محض مسلم افراد کی صورتیں دیکھ کر یا ان کی دعوائے اسلام سے بھری ہوئی تقریریں سن کر اس کے مسلم ریاست ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس ریاست کے ساتھ وہ معاملہ کیا جا سکتا ہے جو شرعاً صرف ایک مسلم ریاست ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص اگر خود اپنی زبان سے مسلم ہونے کا انکار اور غیر مسلم ہونے کا اقرار کر رہا ہو تو ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم اس کی زبان سے بعض اسلامی خیالات سن کر اور اس کی زندگی میں بعض اسلامی علامات دیکھ کر اسے مسلمان مان لیں اور اسے نماز میں امام بنانا یا کسی مسلمان لڑکی سے اس کا نکاح کرنا قبول کر لیں۔ اس طرح کے سارے معاملات اس کے ساتھ بہر حال اس وقت تک نہیں کے جا سکتے جب تک کہ وہ زبان ہی سے شہادتِ اسلام ادا نہ کرے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ ایک غیر اسلامی دستور پر بنی ہوئی مملکت کا بھی ہے کہ جب تک اس کی آئینی زبان شہادتِ اسلام ادا نہ کرے ہم نہ اس کو اسلامی مملکت کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کے ساتھ وہ روابط

قائم کر سکتے ہیں جو شرعاً صرف ایک اسلامی مملکت کے ساتھ ہی رکھے جا سکتے ہیں۔ خواہ اس کی ساری آبادی مسلمان ہو اور اس کے سارے کارفرما و کارپرداز مسلمان ہی ہوں۔

متحدہ ہندوستان میں ہمارا موقف

پاکستان بننے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جو مملکت قائم تھی اس کا دستور صریح طور پر ایک کافرانہ دستور تھا۔ اس میں اسلامی ریاست کے کسی خصوصیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ اس لیے اس میں ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم اس کی تمام ملازمتوں کو اصولاً حرام سمجھتے تھے۔ اس کے قانون کو جائز قانون تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس کی عدالتوں میں جج، وکیل یا مدعی کی حیثیت سے جانے کو شرعاً ممنوع خیال کرتے تھے۔ اس کی مجالسِ قانون سازی کی رکنیت اور اس کے انتخابات میں حصہ لینے کو اسلام کے منافی قرار دیتے تھے اور ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ ایسی ریاست میں سانس لینا بھی ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِلا یہ کہ وہ اسے دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرے۔ پھر اس جدوجہد کی غرض سے ٹھیرنے کی صورت میں بھی ہم اس ریاست کے نظم و نسق اور اس کے قوانین سے صرف اتنے تعلق کو جائز سمجھتے تھے جتنا موجودہ دور کی ایک مملکت میں جینے اور اقامت دین کا کام کرنے کے لیے ناگزیر ہے اور مزید برآں اس ریاست کو "دارالاسلام" میں تبدیل کرنے کی جدوجہد بھی ہم ان طریقوں سے نہ کر سکتے تھے جو موجودہ زمانے کی اصطلاح میں "آئینی طریقے" کھلاتے ہیں۔ کیونکہ انتخابات میں حصہ لینا ہمارے نزدیک شرعاً صحیح نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اس زمانے میں :پُرامن، غیر خفیہ، انقلابی دعوت" کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔

اگست ۴۷ء میں جب سیاسی انقلاب رونما ہوا اور اس کے نتیجے میں پاکستان کی مملکت بنی تو ایک سخت پیچیدہ صورتِ حال پیش آگئی۔

مملکت زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی جو بالعموم اپنی قومی ریاست کو اسلامی ریاست دیکھنے کے خواہش مند تھے اور یہ چیز اس بات کی متقاضی تھی کہ ہم اس کی تعمیر و تشکیل میں اونی قوم کی پوری مدد کریں۔

دستور مملکت جوں کا توں وہی کافرانہ دستور تھا جو سبق انگریزی حکومت چھوڑ گئی تھی۔ اور اس کی وجہ سے نہ شرعاً اس نئی مملکت کی حیثیت پچھلی غیر اسلامی مملکت سے مختلف قرار دی جا سکتی تھی اور نہ اس کے ساتھ کوئی مختلف رویہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔

باشندگانِ ملک کے نمائندوں پر مشتمل ایک دستور ساز اسمبلی بنا دی گئی تھی جسے یہ طے کرنا تھا...... اور آئینی طور پر صرف وہی یہ طے کرنے کی مجاز تھی...... کہ ملک کا مستقل دستور کیا ہو، مگر اس نے نہ تو سابق دستور میں کوئی اصولی ترمیم کی (حالانکہ جزوی ترمیمات بہت سی کیں اور کرتی رہی) اور نہ آئندہ ہی کے متعلق یہ ظاہر کیا کہ وہ ملک کا جدید نظام کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہی وہ پیچیدگی تھی جسے بالآخر قرارداد مقصد نے رفع کیا۔

اصولاً ایک تحریری دستور رکھنے والے ملک میں صرف اس کی دستور ساز اسمبلی اسی نوعیت کے اختیارات رکھنے والی کوئی مجلس ہی وہ آئینی زبان ہو سکتی تھی جس سے شہادتِ اسلام ادا ہونے پر اسے اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا تھا۔ ہماری نوزائیدہ مملکت نے جب اپنی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا کر دی تو جس روز شہادت ادا ہوئی ٹھیک اسی روز جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے اس کے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا اور اس کے ۲۴ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے اب اس کی ملازمت جائز ہے۔ اس کے قوانین اپنی عارضی نوعیت میں قابلِ تسلیم ہیں۔ اس کی عدالتوں میں جانا حلال ہے اور اس کی اسمبلی و پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اس دستوری تغیر کے ساتھ جماعت نے

اپنی پالیسی میں بھی یہ تغیر پیدا کیا کہ وہ آئندہ اس ملک کے انتخابات میں حصہ لے کر آئینی طریقوں سے اس کو مکمل دارالاسلام بنانے کی کوشش کرے گی۔

یہ ہماری تحریک کی تاریخ میں ایک اہم نقطۂ انقلاب تھا جس نے ہمارے لیے ایک طریقِ کار کے بجائے دوسرے طریقِ کار کا دروازہ کھول دیا۔ اب ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دارِ عدو نہیں رہی جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو، بلکہ دارِ دوست، ہمارا اپنا دار بن گئی ہے جسے بنانا، سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا۔

نیا لائحۂ عمل

اس آئینی تغیر کے بعد سے جماعت جس لائحۂ عمل پر کام کر رہی ہے وہ چار بڑے بڑے مقاصد پر مشتمل ہے:

اول یہ کہ اس مملکت کو ان تمام فکری اور عملی رجحانات سے بچایا جائے جو اسے اسلام کے راستے سے منحرف کرنے والے ہیں۔

ڈوم یہ کہ اس عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے یہاں تک کہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قبل بن جائے کہ اس میں برائیاں دبیں اور بھلائیاں نشو نما پا سکیں۔

سوم یہ کہ ہماری اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قراردادِ مقصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قرارداد مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظامِ حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائے۔

چہارم یہ کہ آئینی ذرائع سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے اور اسے بروئے کار لا کر قوانین، نظم و نسق، تعلیم، مالیت، معاشی نظام، فلاحِ عمومی، دفاع اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندہ ریاست بن جائے۔

ہمارے پروگرام کو اس لحاظ سے تقسیم کرنا تو مشکل ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر مقصد کے لیے جو کام ہم کر رہے ہیں اس کو الگ الگ بیان کیا جا سکے۔ کیوں کہ یہ سب مقاصد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے لیے کوئی ایسا کام نہیں کیا جا سکتا جو دوسرے مقاصد کی خدمت نہ کرتا ہو۔ تاہم یہاں کوشش کی جائے گی کہ ان میں سے ہر مقصد کی تھوڑی سی تشریح کر کے یہ بتایا جائے کہ اس کی خدمت کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں اور آگے کیا کرنا چاہتے ہیں۔

مقصد اول

گمراہی کی تحریکوں میں سے جماعت صرف بڑی اور بنیادی گمراہیوں کی طرف متوجہ ہے۔ باقی رہیں چھوٹی گمراہیاں تو وہ در حقیقت طفیلی ہیں۔ ہونے بل بوتے پر قائم نہیں ہیں بلکہ کسی نہ کسی شجر خبیث کی جڑوں سے غزا حاصل کر رہی ہیں اور اسی کے سہارے جی سکتی ہیں، اسی لیے جماعت نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس خطرے کو بھامپ رہی ہے جو جماعت کے کامیاب ہونے کی صورت میں اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ جماعت اس بان کو خوب سمجھتی ہے کہ یہاں اسلام کی اصلی مزاحم دو ہی طاقتیں ہیں۔

مزاحم طاقتیں

(۱) اشتراکیت

ایک اشتراکیت جس کے پاکستانی علمبردار چاہے بہت طاقت ور نہ ہوں مگر اس کی پشت پر ایک عالمگیر تحریک اور ایک زبردست لٹریچر اور ایک جہاں کشا فوجی طاقت ہے۔ یہی چیز اسے ہمارے لیے درجۂ اول کا خطرہ بناتی ہے۔ اس کے نظریات سے محض کھلے کھلے اشتراکی ہی متاثر نہیں ہیں بلکہ وہ ایک وبائی زہر کی طرح پوری اجتماعی فضا میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ طلبہ، پروفیسر، ادیب، اخبار نویس، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن، فوجی افسر، سول محکموں کے عہدے دار، غریب عوام، مزدور اور کسان، حتیٰ کہ بہت سے مذہبی لوگ بھی دانستہ یا نادانستہ ان نظریات سے مغلوب، متاثر اور ماؤف ہیں۔ ان نیم اشتراکیوں کی نہ تعداد کسی کو معلوم ہے نہ ان کی اقسام ہی کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اشتراکیت اور اشتراکیوں پر تو لعنت بھیجتے ہیں مگر خود اشتراکی دماغ سے سوچتے اور اشتراکی زبان میں کلام کرتے ہیں اور قرآن و حدیث تک سے اشتراکیت نچوڑ لاتے ہیں۔

(۲) مغربی الحاد فسق و اباحیت

دوسری مزاحم طاقت مغربی الحاد فسق و اباحیت ہے جو ہمارے اس ملک میں ڈیڑھ سو فرس کی تاریخ رکھتی ہے، جسے انگریزی تعلیم و تہذیب اور اس سیاست نے مدتِ دراز تک دودھ پلا پلا کر پالا ہے، جسے چلتے چلتے انگریز اپنے خلف الصدق کی حیثیت سے مسندِ اقتدار سونپ گیا ہے، اور معاشی اغراض میں اس کے اور اشتراکیت کے درمیان کتنے ہی اختلافات ہوں مگر دونوں ایک ہی مادرِ تہذیب کی بیٹیاں ہیں اور الحاد،

فسق اور اباحیت میں اشتراکی اور غیر اشتراکی متفرنجین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک حقیقی اسلام کے نفوذ و قیام کا راستہ روکنے کا تعلق ہے دونوں اس کام میں متحد ہیں اور ان کی متحدہ کوشش یہ ہے کہ یہاں "اسلام" کے نام سے ایک ایسی تہذیب اور ایسے تمدن کو رائج کیا جائے جو اپنی کسی خصوصیت میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے تمدن و تہذیب سے مختلف نہ ہو اور جس میں اسلام کی مقرر کی ہوئی حدوں میں سے کوئی حد قائم نہ رہے۔

علماء کرام

جماعت اسلامی کا اصل تصادم انہی دو طاقتوں سے ہے۔ علماء کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوئے ہیں یا "کوریا" بنا کر لا کھڑے کیے گئے ہیں۔

سیلاب کا مقابلہ سیلاب سے

کوئی تہذیبی و تمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جا سکتی۔ اس کو روک سکتی ہو تو ایک مقابل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے۔ ہمارے ہاں اب تک سیلابوں کا مقابلہ چٹانیں کرتی رہی ہیں۔ اسی لیے ہمارے ملک سمیت قریب قریب تمام مسلمان ملک مغرب کے فکری و تہذیبی سیلابوں میں غرق ہوتے چلے گئے ہیں۔ اب ہم حرکت کا مقابلہ حرکت سے اور سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب سے کر رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ساری کھوئی ہوئی زمین واپس لے سکیں گے۔ ہماری تحریک کسی ایک گوشے یا ایک میدان میں ان ضلالتوں کا مقابلہ نہیں کر رہی ہے بلکہ ہر میدان میں ہمارا اور ان کا تصادم ہے۔ ہم نے ان کے تمام نظریات اور عملی طریقوں پر تنقید کی ہے اور ان کی کمزوریاں کھول کھول کر سامنے رکھ دی ہیں۔ ہم نے مسئلۂ زندگی کا حل ان کے حل کے جواب میں پیش یہ ہے اور دلائل سے اسے صحیح ثابت کر دیا

ہے۔ ہم ان کے مقابلے میں ایک صالح ادب لائے ہیں، ان کے فلسفوں کے مقابلے میں ایک بہتر فلسفہ لائے ہیں، ان کی سیاست کے مقابلے میں ایک زیادہ مضبوط سیاست لائے ہیں اور ہماری صفوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف قال اللہ و قال رسُول جاننے والے ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ قال ہیگل و قال مارکس و قال فرائڈ بھی انہی کے برابر جاننے والے ہیں۔ درسگاہوں میں جہاں ان کی فکر اور تہذیب کی اشاعت کرنے والے موجود ہیں وہیں انہی کی ٹکڑے فکری و تہذیبی مبلغ ہماری طرف سے بھی موجود ہیں۔ حکومت کے ہر شعبے میں ان کا زہر پھیلانے والے اگر اپنا کام کر رہے ہیں تو ہمارے تریاق کے حاملین بھی بے کار نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کو نکالنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے لیکن اب خدا کے فضل سے ان سب کو چُن چُن کر نکال پھینکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور ان شاء اللہ تجربہ ثابت کر دے گا کہ کسی متحرک نظام فکر و عمل کے متاثرین کو چُن کر چھانٹ پھینکنا صرف ایک بیوقوف ہی ممکن العمل سمجھ سکتا ہے ...... سوسائٹی کے ہر طبقے میں ان کے اثرات کے بالمقابل ہمارے اثرات بھی کم یا زیادہ کار فرما ہیں۔ مزدور اور کسان اور محنت پیشہ عوام جو اَب تک ان کا اجارہ بنے ہوئے تھے بتدریج ان کے اثر سے نکل کر ہمارے اثر میں آتے جا رہے ہیں اور ایک طاقتور رائے عام غیر اسلامی افکار و اخلاق و اطوار کے خلاف تیار ہوتی جا رہی ہے۔ پھر اب سب پر مزید یہ کہ انقلاب قیادت کے لیے ہماری تحریک کی زد براہ راست اس اقتدار پر پڑتی اے جس کے سہارے یہاں محض فرنگیت ہی نہیں، دوسری تمام چھوٹی بڑی ضلالتیں بھی پرورش پا رہی ہیں۔

پھر اس کشمکش کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے دونوں فریق اپنے ہونے نظریات ہی کی نمائندگی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس مخصوص کیریکٹر کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں جو ان نظریات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ ایک طرف اگر اشتراکی اپنے اشتراکی اخلاق اور متفرنجین اپنی فرنگی سیرت کے ساتھ میدان میں موجود ہیں تو دوسری طرف جماعت اسلامی بھی خالی خولی تقریریں اور تحریریں اور اجتماعی سرگرمیاں لیے ہوئے

سامنے نہیں آگئی ہے بلکہ وہ انفرادی سیرت اور جماعتی اخلاق بھی ساتھ لائی ہے جو اسلام کی اگر مکمل نہیں تو کم از کم صحیح نمائندگی ضرور کرتا ہے۔ اس کے اثرات جہاں جہاں پہنچ رہے ہیں وہاں اسلامی خیالات کے ساتھ اسلامی تہذیب اور اسلامی اطوار کا مظاہرہ پورے فخر کے ساتھ سر اونچا کرتے ہوئے کیا جا رہا ہے اور وہ کیفیت دور ہو رہی ہے کہ ماڈرن سوسائٹی میں ایک شخص نماز تک پڑھتے ہوئے شرماتا تھا اور ایک خاتون بُرقع اوڑھنے پر لاکھ معذرتیں کر کے بھی ڈرتی تھی کہ نا معلوم تاریک خیالی کا دھبہ اس کے دامن سے مٹا یا نہیں۔

؁۴۹ اور ؁۵۰ میں ہم نے ضلالتوں کے مقابلے کے لیے اپنے پچھلے لٹریچر پر جن چیزوں کا اضافہ کیا وہ یہ ہیں:

١۔ سود حصہ دوم[8]
٢۔ مسئلۂ ملکیتِ زمین
٣۔ قومی ملکیت
٤۔ پاکستانی عورت دوراہے پر۔

مقصد دوم

ہمارے لائحۂ عمل کا دوسرا بنیادی مقصد جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ "عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے تاکہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قبل بن جائے کہ اس میں برائیاں دبیں اور بھلائیاں نشو و نما پا سکیں۔"

---

[8] اب یہ صرف سود کے نام سے شائع کی گئی ہے۔

تشخیص مرض

اس مقصد کے لیے جس پروگرام پر ہم کام کر رہے ہیں اس کو ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک شخص موجودہ مسلم معاشرے کے امراض کی اُس تشخیص کو اچھی طرح سمجھ لے جو ہم نے کی ہے۔ کیونکہ تشخیص کو سمجھے بغیر علاج کو سمجھنا مشکل ہے۔ نہ ہمارے اپنے کارکن تجویز علاج پر صحیح طریقے سے عمل کر سکتے ہیں اگر وہ تشخیصِ مرض کو نہ سمجھیں، اور نہ ہمارے کام کو دیکھنے والے صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں اگر وہ نہ جانیں کہ ہمارے نزدیک وہ مرض کیا ہے جس کا علاج ہم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ مسلم معاشرے کے عناصرِ ترکیبی!

ہماری نگاہ میں اس وقت ہمارا معاشرہ ٹن مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔

ایک وہ عنصر جو یا تو ذہنی طور پر اسلام سے منحرف ہے یا اخلاقی حیثیت سے اس کی اطاعت وپیروی پر راضی نہیں ہے، یا جس کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اصلی اور حقیقی اسلام اور پورا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ یہ عنصر بہت سے چھوٹے بڑے گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔

ان میں کچھ مخلص ملاحدہ ہیں جو سوچ سمجھ کر غیر اسلامی نظریات پر ایمان لائے ہیں۔ غیر اسلامی قدروں کو دل سے اپنا چکے ہیں۔ اپنے الحاد کا صاف صاف اظہار کرتے ہیں اور اسلام کے نام سے فریب نہیں دیتے۔ اگرچہ اتنی فریب کاری ان میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے نام تبدیل نہیں کیے اور مسلم سوسائٹی سے اپنا ظاہری تعلق نہیں توڑا، تاہم یہی بسا غنیمت ہے کہ وہ اسلام کے علمبردار نہیں بنتے، نہ اُس کے مفسر بن کر سامنے آتے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ مکار ملاحدہ ہیں جن کے دل اور دماغ تو مخلص ملاحدہ ہی کی طرح اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں۔ مگر وہ اس کے علم بردار اور اس کو قائم کرنے کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں تخ مسلمانوں کی قیادت و سیاست پر وہی فائز ہوں اور اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں۔

کچھ اور لوگ نیم الحاد اور نیم اسلام کے مقابل پر ہیں۔ اسلام سے بالکل انکار تو نہیں کرتے مگر قرآن و سنت کا خالص اسلام ان کے لیے نا قابلِ قبول ہے۔ اس کے بجائے وہ اپنی مرضی کا ایک نیا اسلام تصنیف کر کے اسے حقیقی اسلام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی قرآن سے کھیل رہا ہے، کوئی قرآن و حدیث دونوں کو تختۂ مشق بنا رہا ہے، کوئی ابو ذر غفاریؓ کی آڑ لے رہا ہے، اور کسی کے ہاتھوں بے چارے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شامت آ رہی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے اسلام سے بغاوت فکری و نظری بنیادوں پر نہیں بلکہ یا تو اخلاقی بنیادوں پر ہے یا معاشی بنیادوں پر۔ یہ ہمارے مترفین ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ اسلام آکر ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کی آزادیوں پر حدود و قیود عائد کرے، ان کی حرام خوریوں کا خاتمہ کر دے اور ان کے معاشی ظلم کا استیصال کر کے ان کی آمد و خرچ پر پہرے بٹھا دے۔ اس گروہ کے لوگوں کو اسلام کبھی یاد آتا ہے تو صرف اس وقت جب اشتراکی نظریات کی چوٹ ان کے مفاد پر پڑتی نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ اسلام کو اپنے گھرانے کے پرانے خادم کی حیثیت سے پکارتے ہیں کہ آ اور اس غاصب کو مار بھگا دے۔ مگر عین اس فریاد کے وقت بھی وہ اپنی زندگی کے کسی دوسرے معاملے میں اس "خاندانی ملازم" کو بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس باب میں اگر وہ لب کشائی بھی کر بیٹھے تو بے چارہ فوراً "ملازم سے مُلّا اِزم" بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک اور گروہ مذہبی سوداگروں کا ہے جن کا سارا کاروبار ہی اس پر منحصر ہے کہ عام مسلمان ہونے دن سے جاہل رہیں، مشرکانہ اوہام میں بتلا رہیں۔ خلق اور خالق کے درمیان ان کو بطور ایک مستقل واسطے

کے تسلیم کریں اور اپنی بے قید دنیوی زندگی کی کامیابیوں کے لیے نیز ساری بے قیدیوں کے باوجود نجات کی گارنٹی حاصل کرنے کے لیے ان کی روحانی تائید اچھی قیمت پر خریدتے رہیں۔

ان سے بہت مختلف کچھ دوسرے مذہبی سوداگر بھی موجود ہیں جن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی گدیوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی ریاستوں کی حفاظت کا ہے۔ ان میں سے ایک نے جن اسامیوں اور گاہوں کو اگلوں سے میراث میں پایا ہے یا خود اپنی محنت سے فراہم کیا ہے ان کو وہ ہر قیمت پر اپنے کاروبار سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اقامتِ دین کی کسی ہمہ گیر تحریک کو...... خواہ وہ کیسی ہی صحیح بنیادوں پر اٹھی ہو اور کتنی ہی سلامت روی کے ساتھ چلائی جا رہی ہو، اور خود ان کا اپنا علم اور ضمیر اس کے برحق ہونے کی شہادت دے رہا ہو...... برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی فوراً انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں ان کے اپنے حلقے ٹوٹ کر اس بڑے دائرے میں جذب نہ ہو جائیں، اور ان کی مرکزیت مجروح ہو کر نہ رہ جائے۔ ان میں سے اکثر "اہلِ دین" حضرات نے "اہلِ دنیا" سے طرح طرح کی مصالحتیں کر رکھی ہیں۔ دین و دنیا کی تقسیم اور دین کے محدود تصور کو بڑے بڑے نظر فریب دلائل سے ثابت کر رکھا ہے اور ان دلائل کو بڑی بڑی پاکیزہ اور محترم مذہبی شخصیتوں کے ذاتی عمل نے مضبوط کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں اب تک جس تخیل کو مقبولیت حاصل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بہترین نظام زندگی وہ ہے جسے اہلِ دنیا اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہیں اور جن قوانین و ضوابط پر چاہیں چلاتے رہیں مگر مذہبی مراسم بڑی عقیدت مندیوں کے ساتھ ادا کریں، مذہبی شخصیتوں کے آگے خراجِ عقیدت پیش کرتے رہیں، مذہبی اداروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتے رہیں۔ اور مذہب کے محدود دائرے میں اہلِ مذہب کی ریاست کا لحاظ رکھیں اور اگر کہیں وہ ایک شیخ الاسلامی کا عہدہ قائم کر کے پرسنل لاء کی حد تک قضاء و افتاء کے اختیارات اور مذہبی اوقاف و مدارس کی نگرانی بھی ان کے حوالے کر دیں تو بس یہ ایک آئیڈیل اسلامی ریاست ہے۔ ان حضرات کے لیے اب یہ ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر دین کی وہ تعبیر و تفسیر صحیح

ہے جس کی رو سے دین و دنیا کی تقسیم کا ہر نظریہ غلط، کفر و فسق کی سیادت و قیادت سے ہر مصالحت غلط اور پورے نظامِ زندگی پر دین کا ہمہ گیر تسلط ناگزیر، تو اس کے بعد ان کے اُس علم اور عمل کی کیا ساکھ باقی رہ جاتی ہے جو اب تک اِس تعبیر و تفسیر کے خلاف رہا ہے۔

ان مختلف گروہوں کے درمیان آپس میں بڑے اختلافات ہیں اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کر سکتے کہ ان کے اختلافات کو بناوٹی قرار دیں۔ در حقیقت بڑے اخلاص کے ساتھ یہ ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ دین کے بارے میں اس کا نظریہ کسی دوسرے گروہ کے نظریے سے متحد ہے۔ لیکن اس بات کو جاننے اور ماننے کے باوجود جس بناء پر ہم ان سب کو ملا کر ایک عنصر قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب اقامتِ دین کی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو یہ سارے گروہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہو جاتے ہیں۔ پچھلی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے اور آج کا تجربہ بھی یہی ظاہر کر رہا ہے۔ اس لیے تحریک اقامتِ دین کے نقطۂ نظر سے یہ سب ایک ہی عنصر قرار پاتے ہیں۔

پہلا عنصر

تعداد کے لحاظ سے یہ عنصر بحیثیت مجموعی ہماری قوم کا ایک بہت ہی قلیل عنصر ہے، لیکن سیاسی طاقت اور معاشی وسائل، دونوں پر اس کا قبضہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی تعداد اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے اور جھوٹ کی اشاعت سے عوام کو فریب دینے کے بہت سے ہتھ کنڈے اس کے پاس ہیں۔

ہمارا اس عنصر کے ساتھ دوگونہ معاملہ ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے وہ سب ہمارے انسانی اور قومی بھائی ہیں۔ ہم ان کا شخصی احترام کرتے ہیں خواہ وہ ہمیں گالیوں ہی سے کیوں نہ نوازیں۔ ان کے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے بلکہ ہم دل سے ان کے خیر خواہ ہیں اور اپنی حد تک انتہائی کوشش کرتے

ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاحِ خیال ہو جائے اور اللہ تعالی ان کا سینہ حق کے لیے کھول دے۔ لیکن جہاں تک ان کے ایک ایسا عنصر ہونے کا تعلق ہے جو تحریکِ اقامت دین کی راہ روکنے والا ہے، ہماری ان سے جنگ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عنصر کے بہت کم افراد کو بے لاگ حق پرستی کی توفیق نصیب ہوا کرتی ہے اور وہ بھی اپنے نفس کے ساتھ جہاد اکبر کیے بغیر اس چیز کو اختیار نہیں کر سکتے، اس لیے نہ تو محض چند صالح بندے مل جانے کی امید پر اس عنصر کے ساتھ مداہنت برتی جا سکتی ہے اور نہ کوئی ایسا شخص جو دین اللہ الخاص کے قیام کا خواہش مند ہو، اس کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اقامت دین کی راہ کا روڑا یہی عنصر ہے۔ اس کو ہٹانا عوام الناس کو اس کے دباؤ اور اثر سے نکلنا اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگزیر تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی تعمیری و اصلاحی کام بار آور ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا عنصر

دوسرا عنصر ان صالح لوگوں پر مشتمل ہے جو دین کو تھوڑا بہت جانتے ہیں، اور جس قدر بھی اسے جانتے ہیں اس کو اخلاص کے ساتھ مانتے اور ہر اس چیز کی اطاعت و حمایت کے لیے تیار رہتے ہیں جو کتاب اللہ و سُنتِ رسولؐ اللہ کی دلیل سے حق ثابت ہو جائے۔ یہ لوگ قوم کے ہر طبقے میں موجود ہیں، غریبوں میں بھی اور امیروں میں بھی، رعیت میں بھی اور حاکم میں بھی، نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اور پرانے طرز کے علماء میں بھی۔ اگرچہ یہ بھی تعداد میں بہت کم ہیں لیکن مایوس کن حد تک کم نہیں ہیں۔ بلکہ شاید ہم مبالغہ نہ کریں گے اگر نہ کہیں کہ اول الذکر عنصر سے اس دوسرے عنصر کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم کی اصلی طاقت یہی لوگ ہیں اور یہاں اصلاح کی جتنی امیدیں ہیں، انہی سے وابستہ ہیں۔ اپنی بد اعمالیوں کے باوجود اب تک اس قوم پر اللہ کی جو رحمتیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کی وجہ یہی ہے کہ اس

گئی گزری حالت میں بھی یہ بقیہ القوم اس کے اندر معتد بہ تعداد میں موجود ہے اور اس کے ہاتھوں خیر و صلاح کے قیام کے امکانات ہیں۔

اس گروہ میں مختلف قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے ناقص مطالعے کی وجہ سے دین کے محدود تصور میں مبتلا ہیں اور وسیع و ہمہ گیر تصور کو اخذ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ بعض جزئیات و کلیات کے فرق کو سمجھتے اور غیر اہم چیزوں کو اتنا اہم قرار دے بیٹھے ہیں کہ اصل اہمیت رکھنے والی چیزیں ان کی نگاہ میں کم وزن ہو گئی ہیں۔ بعض کا فہمِ دین تو صحیح ہے، مگر یا تو وہ اپنے فرض کو ابھی تک پوری طرح نہیں پہچانتے، یا ان کے اندر قوتِ عمل کی کمی ہے، یا اُن پر یاس کا غلبہ ہے، یا اُن کو علم نہیں ہے کہ ان کے ملک میں اقامتِ دین کو کوئی سعی ہو رہی ہے یا وہ سعی کرنے والوں کو ابھی شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، یا انہیں توقع ہے کہ محدود قسم کی اصلاحی تدبیروں سے کام چل جائے گا۔

ہماری تمام تر کوشش یہ ہے کہ اس عنصر کی یہ سری کمزوریاں دور ہوں، یہ بیدار ہو، منظم ہو، حرکت میں آئے، اور خواہ یہ ہمارے ساتھ ملے یا نہ ملے، بہرحال اقامت دین کی سعی میں ہم کو اس کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل ہو۔

تیسرا عنصر

تیسرا عنصر عوام پر مشتمل ہے یہ ہماری قوم کا سوادِ اعظم ہے۔ ہماری کل آبادی کا ۹۰ فیصدی، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ لوگ اسلام سے گہری عقیدت اور مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ اس کے نام پر جان و مال پہلے بھی قربان کرتے رہے ہیں اور آج بھی اس پر آمادہ ہیں۔ اسلام کے سوا کوئی چیز ان کو اپیل نہیں کرتی، اور جس چیز کو یہ جان لیں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ اسے چاہے مجبوراً برداشت کر لیں، دل سے کبھی گوارا نہیں کرتے، مگر ان غریبوں کو کئی روگ لگے ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا اور بنیادی روگ یہ ہے کہ جس اسلام سے یہ عشق رکھتے ہیں اس کو جانتے نہیں ہیں۔ اس کی تفصیلات سے ہی نہیں، اس کے اصول و بندی تک سے بے خبر ہیں۔ اسی لیے ہر ضال و مضل شخص اسلام کا لباس پہن کر ان کو بہکا سکتا ہے۔ ہر غلط عقیدہ اور غلط "طریقہ اسلام" کے نام سے ان کے اندر پھیلایا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا روگ یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے ان کی اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ یہ خود رَو درختوں کی طرح اُگتے اور پرورش پاتے رہے ہیں۔ اسلامی اخلاق تو درکنار، بنیادی انسانی اخلاقیات تک ان میں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی گے بلکہ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے دورِ غلامی میں اخلاقی حیثیت سے یہ مسلسل پستی کی جانب بڑھتے رہے ہیں۔

اس پر مزید یہ کہ ان کی اپنی قوم کے اہلِ دماغ اور با اثر طبقوں کے (جن کو ہم نے پہلے عنصر میں شمار کیا ہے) انہیں اور بہت سے نئے روگ لگا دیئے ہیں۔ یہ غریب تعلیم کے لیے جدید درس گاہوں میں جاتے ہیں تو وہاں زیادہ تر مخلص اور مکار ملاحدہ یا نیم مسلم و نیم ملحد حضرات سے ان کو پالا پڑتا ہے۔ قدیم مدارس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اکثر مذہبی سوداگروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ دینی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خطیبوں اور واعظوں کی عظیم اکثریت انہیں گمراہ کرتی ہے۔ روحانی تربیت کے طالب ہوتے ہیں تو پیروں کی غالب اکثریت ان کے لیے راہِ خدا کی رہزن ثابت ہوتی ہے۔ دنیوی معلومات کے سرچشموں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اُن اخبارات اور رسائل سے ان کو سابقہ پیش آتا ہے جن کی بہت بڑی اکثریت ہماری قوم کے سب سے زیادہ رذیل طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ قومی اور ملکی معاملات کی سربراہ کاری کے لیے لیڈر ڈھونڈتے ہیں تو وہ زیادہ تر ملاحدہ اور نیم ملاحدہ اور مترفین کے گروہ سے نکلتے ہیں۔ اپنی معیشت کی تلاش میں رزق کے منبعوں کی طرف جاتے ہیں تو وہاں بیشتر اُن لوگوں کو قابض پاتے ہیں جنہوں نے حرام و حلال کے امتیاز کو مستقل طور پر ختم کر رکھا ہے۔ غرض ہماری قوم کے وہ طبقے جو دراصل ایک قوم کے دل اور

دماغ ہوتے ہیں اور جن پر اس کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار ہوا کرتا ہے، اس وقت بد قسمتی سے ایک ایسا عنصر بنے ہوئے ہیں جو اسے بنانے کے بجائے بگاڑنے پر تُلا ہوا ہے اور بناؤ کی ہر صحیح و کارگر تدبیر میں مزاحم ہے۔

تجویزِ علاج

موجودہ مسلم معاشرے کے عناصرِ ترکیبی کا یہ تجزیہ اور اس کے امراض کی یہ تشخیص اگر صحیح کے، تو اب تجویز علاج پر غور کیجیے۔ ہمارے نزدیک علاج کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ:

عنصرِ دوم کو جہاں تک ممکن ہو قوم کے تمام طبقوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جائے۔ ان کی ذہنی و اخلاقی کمزوروں کو دور کرنے کی پوری و=کوشش کی جائے اور انہیں منظم کر کے اصلاح کے کام میں لگایا جائے۔

عنصرِ سوم میں اسلام کا صحیح علم اور جامع و ہمہ گیر تصور زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور ان کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کو نشو و نما دینے کی با قاعدہ سعی کی جائے۔

عنصرِ اول کے ضمیر کو پوری حکمت اور دل سوزی کے ساتھ اپیل کرنے کی کوشش تو برابر جاری رہے مگر اصلاح کی بے جا توقعات اس سے وابستہ کر کے قوم کے سوادِ اعظم کو اس کے قبضہ و تسلط سے نکالنے کی کوشش میں ہرگز تساہل یا نرمی و ریایت سے کام نہ لیا جائے۔ رہا اس کے جھوٹ کا طوفان اور اس کے فتنوں کا میگزین اور اس کا سیاسی اور معاشی دباؤ، تو اس سے ڈر کر پیچھے ہٹنا تو ہمارے نزدیک فرار من الزحف سے کم تر درجے کا گناہ نہیں ہے۔

اصلاحی پروگرام

علاج کی اس تجویز کو سمجھ لینے کے بعد کسی شخص کو ہمارے عملی پروگرام کو سمجھنے میں زحمت پیش نہیں آسکتی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے عوام کو اسلامی ریاست کے صحیح تصور سے آشنا کرنے اور مطالبۂ نظام اسلامی پر متفق کرنے کی جو کوشش کی تھی، اور اس کے ساتھ ہمدردوں اور متفقین کے حلقے بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے اندر اس تجویز علاج کے مذکورہ بالا تینوں اجزاء کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ پھر قرارداد مقاصد پاس ہونے کے بعد اس کے تضمنات (implications) اور اس کے تقاضوں کو کھول کھول کر عوام کے ذہن نشین کرنا، اس کی ایک ایک خلاف ورزی کو، جو عنصرِ اول کی طرف سے ہوئی، نمایاں کرکے عوام کو اس کی طرف توجہ دلانا، اس کی تعمیل پر ارباب اقتدار کو مجبور کرنے کے لیے رائے عام کو تیار کرنا، اور صالح قیادت کی ضرورت و اہمیت عوام کے ذہن نشین کرنا، یہ سب کچھ بھی اسی تجویز علاج کے مطابق تھا۔ اس کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ اور اس کا مخصوص طریق کار بھی اسی تجویز علاج کے پروگرام کا ایک جزو تھا اور ہے۔ صرف ایک پنجاب کی انتخابی جدوجہد ہی میں ہم نے پانچ چھ مہینوں کی مختصر مدت میں کم وبیش ۲۵ لاکھ آدمیوں تک، جن میں دیہاتی اور شہری دونوں قسم کے عوام شامل تھے، اسلام کی دعوت پہنچائی۔ ان میں سے تقریباً سوا دو لاکھ آدمیوں کو ہر خوف اور لالچ اور فریب کے علی الرغم اس دعوت کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کر لیا۔ اور ان میں سے عنصرِ دوم کے تقریباً دو ہزار نئے آدمیوں کو اصلاح کی عملی سعی میں ہاتھ بٹانے کے لیے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی طریقے سے اب سرحد و سندھ کے انتخابات کو بھی ان شاء اللہ ہم اس مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور کریں گے۔ یہ ہماری ابتدائی کوششیں تھیں۔ اب اس علاج کے لیے جو جامع پروگرام ہم نے بنایا ہے وہ ہماری مجلس شوریٰ کے تازہ اجلاس کی کاروائی میں سامنے آچکا ہے۔ اس پروگرام کی خصوصیات یہ ہیں:

(۱) حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم اس غرض کے لیے ہے کہ اصلاح کے کام میں عنصرِ دوم کا تعاون زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر، اور زیادہ سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ حاصل کیا جائے۔

(۲) تربیت گاہوں کا قیام اس غرض کے لیے ہے کہ ارکانِ جماعت کے ساتھ ساتھ متفقین کو بھی ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس کارِ عظیم کے لیے تیار کیا جائے۔

(۳) حلقہ ہائے متفقین کے سامنے سردست کام کا جو ابتدائی پروگرام رکھا گیا ہے وہ اس غرض کے لیے ہے کہ متفق احباب اور خواتین بتدریج عوام سے ربط پیدا کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور ان کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تمدنی اور معاشی حالت درست کرنے کے لیے سعی کی ابتدا کر دیں۔ آگے چل کر رفتہ رفتہ اس دائرۂ عمل کو زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(٤) مزدوروں اور پیشہ ور گروہوں کی تنظیم اس غرض کے لیے ہے کہ ان امعاشی مشکلات کے حل میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی اور دینی حالت کو بھی درست کیا جائے اور انہیں اشتراکی تحریک کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے۔

مقصدِ سوم

ہمارا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قراردادِ مقاصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قراردادِ مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظامِ حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائے۔

اس کام کی اہمیت کیا ہے اور کس قدر ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہو کہ سب سے پہلے ہم قرارداد مقاصد کی اصل قدر و قیمت کو اچھی طرح مشخص کر لیں۔ اس قرارداد سے پاکستان کی

آئینی حیثیت میں جو تغیر ہوا ہے وہ در حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ ملک اصولاً دار الاسلام بن گیا ہے، اس ذرا سے تغیر نے وہ سب کچھ ہمیں نہیں دے دیا ہے جو ہمیں مطلوب تھا۔ ابھی ایک بہت بڑا کام باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مملکت کو عملاً دار الاسلام بنایا جائے۔ تمثیل کے پیرائے میں اس کو یوں سمجھتے کہ قرارداد مقاصد تو محض ایک کلمۂ شہادت ہے جسے ادا کر کے ایک غیر مسلم نے قبولِ اسلام کا اعلان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی بڑی چیز ہے اور اس کے شرعی نتائج اپنی جگہ بڑے اہم ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر مجرد قبولِ اسلام سے وہ سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا ہے جو تبلیغِ اسلام کا مقصود ہے۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوا ہے اس کے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی میں بھی اسلام کے منشاء کے مطابق تغیر ہو۔ وہ فرض کو فرض مانے اور اسے ادا کرے، حرام کو حرام جانے اور اس سے بچے، خدا اور رسولؐ کے حکم کو اساسِ قانون تسلیم کرے اور اس کے آگے سر جھکائے، شریعتِ خداوندی کی مقرر کو ہوئی حدوں کو پہچانے اور اپنے عمل کو ان کے اندر محدود کرے۔ یہ تغیرات جب تک اس کی زندگی میں نہیں ہوں گے اس کی حالت اس نو مسلم کی سی ہوگی جو بس کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا ہو۔ باقی رہے خیالات، اخلاق اور اعمال تو ان کے لحاظ سے وہ ایسا ہی غیر مسلم ہے جیسا کلمہ خوانی سے پہلے تھا۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ کسی فرد کے معاملے میں بھی قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی کجا کہ ایک "مملکت اسلامیہ" کے معاملے میں قابلِ اطمینان ہو سکے۔ جہاں تک ایک غیر تحریری دستور رکھنے والی مملکت کا تعلق ہے، اس میں تو یہ تغیرات بتدریج "رواج" کی تبدیلی سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی مملکت کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس کے دستور میں اُن تمام تغیرات کو واضح طور پر ثبت کیا جائے جو اس "کلمہ خوانی" کی مناسبت سے اس کے نظم میں ہونے چاہئیں۔ اس کے بغیر نہ اس کا پچھلا طریقِ عمل بدل سکتا ہے اور نہ اسے اسلام کے مطابق کسی طریقِ عمل کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہے وہ کام جو ابھی دار الاسلام کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں کرنا باقی ہے۔ اب دوسری طرف ذرا اُن حالت کو دیکھئے جن میں یہ باقی ماندہ کام انجام پانا ہے۔ ہم اس امر واقعی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ ہمارے اس ملک میں اسلام کی طرف رجحان خواہ کتنا ہی عام ہو اس کا علم بہت کم ہے اور اسلامی طور طریقوں کی عملی تربیت کا تو اس سے بھی زیادہ فقدان ہے۔ ہماری سیاست کی زمامِ کار جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس کا پورا ذہنی نشو و نما مغربی تعلیم اور مغربی ماحول میں ہوا ہے۔ ہمارے نظم و نسق کی مشینری جن ملازمینِ حکومت کے ذریعے سے چل رہی ہے انہوں نے آج تک جتنی بھی تربیت پائی ہے مغربی طرز پر ہی حکومت کا انتظام کرنے کی پائی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس کے شعور اور ارادے کی صحت اور جس کی فرض شناسی پر ہماری قومی زندگی کا مدار ہے، افسوسناک حد تک دماغی انتشار میں بتلا ہے اور اگر کچھ تھوڑا بہت اسلامی شعور اس میں پیدا ہوا بھی ہے تو ارادے کی کمزوری اور فرض سے غفلت نے اس کو بہت کچھ غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ رہے عوام جن کا ووٹ ایک جمہوری نظام میں بہر حال فیصلہ کن ہوتا ہے، تو وہ ہمارے ہاں ابھی نہ اس لائق ہیں کہ اسلامی دستور اور غیر اسلامی دستور کے فرق کو سمجھ سکیں۔ اور نہ ان کے اندر ابھی تک ایسی طاقت ور اور منظم رائے عام پیدا ہو سکتی ہے کہ مملکت کی گاڑی کو غلط سمت میں جاتے دیکھ کر روک سکیں اور صحیح سمت کی طرف موڑنے پر مجبور کر سکیں۔ اس حالت میں اصولی دار الاسلام کو عملی دار الاسلام بنانے کا وہ عظیم الشان کام جو ابھی باقی ہے، اس سے بہت زیادہ دشوار نظر آنے لگتا ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے۔

یہ دشواری بھی شاید ہلکی ہی ہوتی اگر برسرِ اقتدار لوگ صرف اسلام سے نہ واقفیت کا مریض ہوتا، اس سے فرار کی خواہش کا روگی نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز دردِ سر کی موجب ہو سکتی تھی تو وہ بس یہ کہ مغربی افکار و نظریات اور مغربی ریاستوں کے نظائر سے ان کی فریفتگی کیسے دور کی جائے اور اسلامی مملکت کی دستوری خصوصیات کس طرح ان کے ذہن میں اتاری جائیں اور ایک نئی عمارت ایسے

معماروں کے ہاتھوں میں کس طرح بنوائی جائے جو اس طرزِ تعمیر سے بالکل نابلد ہیں۔ مشکلات اتنی ہی ہوتیں تو انہیں رفع کرنے کے لیے سعیِ فرہاد درکار نہ ہوتی لیکن یہاں معاملہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم اسے بھول نہیں سکتے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہ لوگ اسلامی ریاست کے مفہوم اور تصور میں کیسا کچھ گھپلا کرتے رہے ہیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد مسلسل ۱۹ مہینے تک یہ کس طرح اسلامی ریاست کے سوال کو ٹالتے رہے اور اس سے بچنے کے لیے کیسی کیسی چالیں انہوں نے چلیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد کی کڑوی گولی کس بدمزگی کے ساتھ انہوں نے حلق سے اتاری۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد پاس کرنے کے بعد کوئی برائے نام تغیر بھی انہیں نے پچھلے تیس مہینوں کے اندر اپنی حکومت کے طور طریق میں نہیں کیا جسے اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہو کہ انہوں نے یہ قرارداد نیک نیتی کے ساتھ منظور کی تھی۔ پھر وہ دستوری سفارشات تو ابھی پچھلے ہی سال ہمارے سامنے آچکی ہیں جو ان حضرات نے ایک مدت کی کاوش کے بعد مرتب کی تھیں اور جن میں یہ لوگ بالکل بے نقاب ہو کر ایک سراسر غیر اسلامی دستور کا خاکہ لیے ہوئے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اب جو مہم درپیش ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے جو قراردادِ مقاصد کی منظوری سے پہلے درپیش تھی۔

ان حالات میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پروگرام یہ ہے:

ایک طرف اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور اس کی دسوٹھری خصوصیات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھی جائے تاکہ تعلیم یافتہ طبقے کی زہنو الجھنیں بھی دور ہوں اور ہمارے دستور سازوں میں سے بھی جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ اس معاملے میں روشنی حاصل کرنا چاہیں انہیں روشنی مل سکے۔ اس غرض کے لیے ہم نے ۵۰ء میں ہونے سابق لٹریچر پر "اسلامی ریاست" کے عنوان سے ایک اور سلسلے کا اضافہ کیا جس کے چار حصے "شہریت کے حقوق و فرائض"، "غیر مسلموں کے

حقوق"، "کارکنوں کی ذمہ داریاں" اور "اطاعت کے شرائط و حدود" کے نام سے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔

دوسری طرف عوام الناس کو اسلامی ریاست کے تصور سے قرارداد مقاصد کے مفہوم و مدعا اور اس کے تقاضوں سے، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے معاملہ میں بس سر اقتدار طبقے کی کوتاہیوں سے پیہم آگاہ کیا جاتا رہے تاکہ رائے عام اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ بے دار ہو اور تیار ہو اور اس قرارداد کو پس پشت ڈال دینا یا اسے مکر و فریب کا شکار بنا لینا کسی کے لیے آسان نہ رہے۔ یہ کام مارچ ۴۹ء کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اسے آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا، البتہ اس میں حکمت اور اعتدال کے اس تقاضے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بات کی اتنی زیادہ تکرار بھی نہ کی جائے کہ عام طبائع اس سے اکتا جائیں اور اس کا اثر لینے کے بجائے اُلٹا اس سے استخفاف برتنے لگیں۔

تیسری طرف بر سر اقتدار طبقے کے ہر اس قدم کی شدت سے مزاحمت کی جائے جو وہ قرارداد مقاصد کے منشاء کے خلاف دستور بنانے کے لیے اٹھائے۔ پچھلے سال بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان کی اشاعت کے بعد فوراً ہی ان پر تنقید کی گئی[9] اور خدا کے فضل سے ملک کے تمام اسلامی رجحانات رکھنے والے طبقوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات کو نظر انداز کر کے پورے اتحاد کے ساتھ بس سر اقتدار طبقے کے اس قدم کی مزاحمت کی۔ یہ ایک اچھا سبق تھا جو ان لوگوں کو دیا گیا اور ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی جب کبھی وہ ایسی غلطی کریں گے ان کو ایسا ہی سبق دیا جائے گا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً یہ لوگ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں جس سے عوام الناس کی توجہ ملک کے بنیادی مسائل سے ہٹ کر کسی اندرونی یا بیرونی قضیے کی طرف مرتکز ہو جاتی ہے اور

---

[9] ملاحظہ ہو ہمارا پمفلٹ "دستوری سفارشات پر تنقید"

اس سے فائدہ اٹھا کر یہ عارضی طور پر اپنا رنگ جما لیتے ہیں، لیکن ہم اللہ تعالٰی کی تائید سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی تدبیر انہیں یہ موقع کبھی نہ دے سکے گی کہ: یہ اپنا من مانا دستور اس ملک پر مسلط کر سکیں۔

مقصد چہارم

ہمارے لائحۂ عمل کے بنیادی مقاصد میں سے چوتھا اور آخری مقصد یہ ہے کہ آئینی ذرائع سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے اور اسے بروئے کار لا کر قوانین، نظم و نسق، تعلیم، مالیات، معاشی نظام، فلاح عمومی، دفاع اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرنے والا آئیک ملک بن جائے"

اس مقصد کو اور اس پروگرام کو جو اس کے لیے ہم نے اختیار کیا ہے، سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند مقدمات ذہن نشین کر لیے جائیں۔

1) ہمارا اجتماعی نصب العین ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف ہم خود اُن تمام روحانی، اخلاقی اور مادی برکات سے متمتع ہوں جو اسلام ہمیں عطا کرتا ہے اور دوسری طرف ہم اونی قومی زندگی میں اسلامی عدل، اسلامی اخلاق اور اسلامی نظام حیات کا ایسا مظاہرہ کریں جس سے تمام دنیا کے سامنے اسلام کے دینِ حق ہونے کی شہادت ادا ہو اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لیے ہم ایک اُمت بنائے گئے ہیں:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۴۳:۲)

2) یہ نصب العین کسی طرح متحقق نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارے اجتماعی معلمات کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو حکومت کی صلاحیت اور انتظام کی قابلیت رکھنے کے

ساتھ آسمانی ذہنیت اور اسلامی سیرت بھی رکھتے ہوں اور یہ استعداد بھی اُن میں ہو کہ زمانۂ جدید کو ایک ترقی یافتہ ریاست کا نظام اسلام کی ہدایت کے مطابق چلا سکیں۔

3) جہاں تک موجودہ قیادت کا تعلق ہے، اس کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہے، بلکہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ان اوصافِ مطلوبہ کے عین برعکس ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے۔

4) اگر ملک میں حکومت کسی خاندان یا کسی طبقہ یا گروہ کا اجارہ بن گئی ہو اور اسے تبدیل کرنے کے لئے کوئی آئینی طریقِ کار موجود نہ ہو تو تب تو مسلح انقلاب کی سعی ناگزیر ہے، لیکن اگر ملک میں ایک جمہوری نظام قائم ہو اور اس میں آئینی طریقِ کار سے حکمرانوں کی تبدیلی کا کچھ بھی امکان باقی ہو تو پھر صحیح راستہ یہی ہے کہ عوام الناس کو فاسق قیادت اور صالح قیادت کے فرق سے آشنا کیا جائے، صالح قیادت کی طلب اور اس کی معرفت ان میں پیدا کی جائے۔ اسلامی طرز پر ملک کے انتظام کا ایک واضح پروگرام ان کے سامنے پیش کیا جائے اور بتدریج ان کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ اپنے اندر سے ایسے صالح آدمی چھانٹ لیں جو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

5) جمہوری نظام میں بگاڑ کی اصلاح محض باتوں سے نہیں ہو جایا کرتی بلکہ اس کے لیے برسوں کی منظم جدوجہد اور جانفشانی درکار ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں عوام الناس کے ووٹوں سے حکمران منتخب کیے جاتے ہوں وہاں اگر بگاڑ پایا جاتا ہے تو لامحالہ اس کا سرچشمہ چار ہی چیزیں ہوں گی:

a) عوام الناس اور بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ۔

b) ایک ایسے با اثر طبقے کی موجودگی جو عوام کی ان کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اقتدار کی مسندوں پر قبضہ جما رہا ہو اور معاشرے میں ایسے متعدد عناصر کی موجودگی جو ان علمبردار انِ شر کے حامی و ناصر ہوں۔

c) نظم و نسق کی مشینری کا ایسے بے ضمیر اور نا فرض شناس کارکنوں کے ہاتھ میں ہونا جو آئین کے حدود کو توڑ کر انتخابات میں بگاڑ کے علمبرداروں کی مدد کرتے ہوں، اور

d) انتخابات کے طریقِ کار میں ایسی بنیادی غلطیوں کا موجود ہونا جن کی وجہ سے صحیح انتخاب نہ ہو سکتا ہو۔

ان چاروں اسبابِ خرابی کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو اسے اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ جب تک یہ اسباب باقی ہیں قیادت کبھی فساق و فجار کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتی اور صالح نظام کبھی برپا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی شبہ نہ رہے گا کہ انتخابات سے بے تعلق رہ کر محض تبلیغ و تلقین اور تزکیۂ نفس کے ذریعے سے نظامِ حق قائم نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی تردد نہ رہے گا کہ اصلاح جب بھی کرنی ہو، اسی طرح کرنی پڑے گی کہ براہ راست انتخابات میں دخل دیا جائے اور پیہم منظم کوشش اور حکیمانہ تدبیر کے ساتھ ان خرابیوں کی جڑیں کاٹی جاتی رہیں یہاں تک کہ آخرکار عوام الناس صحیح طریقے سے صحیح مقصد کے لئے صحیح آدمی منتخب کرنے کے قابل ہو جائیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں اسلام برسرِ اقتدار آسکتا ہے۔

یہی کام ہے جو ہم نے پچھلے سال سے شروع کیا ہے۔ انتخابات کے طریقوں کی اصلاح کے لئے جو پروگرام ہم نے اختیار کیا ہے وہ "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ ملکی انتظام کے مختلف شعبوں میں جو اصلاحات ہم چاہتے ہیں ان کا مفصل نقشہ ہم نے اپنے "منشور" میں پیش کردیا ہے...... سردست چونکہ انتخابات صرف صوبوں میں ہو رہے ہیں اس لئے ابھی ہم نے صرف

یہ بتایا ہے کہ ۳۵ء کی حدبندیوں کے اندر ایک صوبائی حکومت کے اختیارات سے کام لے کر اسلام کے منشاء کے مطابق زندگی کے نظام میں کیا اصلاحات کی جا سکتی ہیں...... آگے چل کر اگر کبھی انتخابات کی نوبت آئی تو ہم ان شاء اللہ یہ بھی بتائیں گے کہ پورے ملک کے نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کیا صورت ہے۔[10] ان دو چیزوں کو لے کر ہم رائے عام کی تربیت اور تنظیم کا کام اب عملاً کر رہے ہیں اور پہلی ہی انتخابی جدو جہد میں جو نتائج حاصل کیے ہیں وہ ہماری "مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۵ تا ۱۷، اپریل ۱۹۵۱ کی روداد" میں شائع ہو چکے ہیں۔[11] ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طریقے پر مسلسل کام کیا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ عوام کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ بھی دور ہو گی، ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے عناصر کا زور بھی ٹوٹے گا، حکومت کے نظم و نسق میں جس قدر بھی صاحبِ ضمیر اور فرض شناس عناصر موجود ہیں ان کی ہمدردیاں بھی ایمان دار لوگوں کے ساتھ شامل ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی مدد اور رائے عام کی تائید سے بالآخر اُن بے ایمانیوں کا سدِباب بھی کیا جا سکے گا جو انتخابات میں فساق کے سر کامیابی کا سہرا باندھا کرتی ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس امر کا امکان پیدا ہو گا کہ یہاں اقتدار کی باگیں اُن صالح انسانوں کے ہاتھ میں آئیں جو پورے اسلام کو اس کی اصلی شان کے ساتھ اس ملک میں نافذ کرنے والے ہوں۔

کوئی اللہ کا بندہ آنکھیں رکھتا ہو اور دیکھنا چاہتا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ دراصل ہمارا یہ آخری قدم نظامِ فسق و ضلال کے قلعے کی طرف براہ راست پیش قدمی ہے اور ایک فیصلہ کن ضرب ہے جو ٹھیک اس کی فصیلوں پر جا کر پڑتی ہے۔ اگر ہم اپنے مقاصد میں سے صرف پہلے تین مقاصد کے لیے کام کریں یا چوتھے مقصد کو بھی اپنے لائحۂ عمل میں لے تو لیں مگر اسے حاصل کرنے کے لیے انتخابات میں حصہ نہ لیں، تو

---

[10] نئی منشور 29ء میں یہ باتیں وضاحت سے بیان کر دی گئی ہیں

[11] ضمیمہ میں ملاحظہ فرمائیں (صفحہ ۷۸ ساے صفحہ ۸۲)

نہ قیادتِ فاسقہ کبھی ہٹ سکتی ہے اور نہ وہ قیادتِ صالحہ کبھی قائم ہو سکتی ہے جس کے قیام پر نظامِ اسلامی کا قیام منحصر ہے۔ یہ عملی انقلاب اگر رونما ہو سکتا ہے تو اسی آخری قدم سے ہو سکتا ہے جو ہم نے اب اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ قدم نہ اٹھایا تھا کسی نہ کسی طرح ہمیں برداشت کیا جا رہا تھا مگر جونہی یہ قدم ہم نے اٹھایا، قیادتِ فاسقہ اور اس کے مددگار سب کے سب یک لخت بھڑک اٹھے۔ پاکستان سے لے کر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی، پرانے پرانے دشمن جو کبھی جمع نہ ہو سکتے تھے، اس خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہو گئے۔ دیوبند اور بریلی گلے مل گئے۔ پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہو گیا، اہلِ حدیث اور منکرینِ حدیث متفق ہو گئے۔ قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا۔ ہماری دس بارہ برس کی پرانی تحریروں میں سے وہ گمراہیاں ٹپکنی شروع ہو گئیں جو پہلے کبھی نظر نہ آئی تھیں یا دین کے لئے خطرہ نہ سمجھی گئی تھیں۔ ہندوستان کے کانگرسی علماء تک دینی حمیت کے تقاضوں سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں۔ حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شانِ تواضع کے ساتھ جماعتِ اسلامی کی وہ ساری برائیاں گنوا دیں جو ان کے خیال مبارک میں تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے کہ یہ قدم ہم نے ٹھیک صحیح رخ پر اٹھایا ہے تو نامعلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے۔ ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتے دیکھ کر اُس پر طاری ہوا کرتی ہے۔

[12]

---

[12] ہمارے آئندہ لائحۂ عمل کہ مفصل طور پر سمجھنے کے لئے ہماری کتاب "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل" مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور کا مطالعہ فرمائیے۔

ضمیمہ نمبر ۱

۱۔ (متعلقہ صفحہ نمبر ۷۶)

مجلس شوریٰ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان تمام خرابیوں کے باوجود جو انتخابات کے موجودہ قوانین اور طریقوں میں پائی جاتی ہیں اور ان تمام اخلاقی کمزوروں کے باوجود جو ہمارے عوام اور خواص میں موجود ہیں اور پنجاب کے پچھلے انتخابات میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے آچکی ہیں اور ان تمام ناجائز مداخلتوں کے باوجود جن کا ارتکاب حکومت کی انتظامی مشینری نے خود حکومت کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط کے خلاف پنجاب کے پچھلے انتخابات میں کھلم کھلا کیا اور جن کا ارتکاب ایک مدت تک اس کی طرف سے ان تمام انتخابات میں ہوتے رہنے کا اندیشہ ہے جو پاکستان میں کہیں منعقد ہوں، اور ان تمام بد اخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کے باوجود جن کا ارتکاب مخالف سیاسی پارٹیاں انتہائی بے باکی کے ساتھ اور بڑے وسیع پیمانے پر عام انتخابات میں کرتی ہیں، کر چکی ہیں اور بظاہر ایک مدت تک کرتی رہیں گی اور اس کے باوجود جماعت اسلامی کے پاس وسائل اور مردانِ کار کی بہت کمی ہے، اس معاملے میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آخر کار یہاں آئینی ذرائع سے اصلاح کی جا سکے گی۔

مجلس شوریٰ جن ٹھوس حقائق کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہیں کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں بہت محدود ذرائع کے ساتھ جماعت کی صرف پانچ مہینے کی انتخابی جدوجہد سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) پنجاب کے ۱۳۷ انتخابی حلقوں میں تقریباً پچاس ہزار آدمی ایسے نکلے جنھوں نے ہماری انتخابی پالیسی کو صحیح سمجھ کر ووٹر کے عہدنامے پر دستخط کیے۔

(۲) ان حلقوں میں ۱۳۹۰ بستیاں ایسی نکلیں جنہوں نے صالح نمائندوں کے انتخاب کے لیے اپنی مقامی پنچائتیں بنائیں۔

(۳) ان حلقوں میں جو مرکزی پنچایتیں بنائی گئیں ان میں ۲۱۱۹ نمائندوں نے عملاً شرکت کی اور اپنی حد تک پوری دیانت داری کے ساتھ ۱۵۳ ایسے آدمیوں کو اپنے اپنے حلقوں کی نمائندگی کے لیے چُنا جو علمی اور اخلاقی حیثیت سے نمایاں طور پر دوسری پارٹیوں کے امیدواروں اور آزاد امیدواروں کے مقابلے میں فائق تر تھے اور جن کی سیرت پر ان کے مخالفین بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے۔

(۴) اس انتخابی جدوجہد کے دوران میں عام پبلک میں سے سترہ سو ایسے نئے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے ہمارے کارکنوں کا پوری طرح سے ہاتھ بٹایا اور بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے، تمام اخلاقی پابندیوں کے ساتھ جو ہم نے اپنے کارکنوں پر عاید کر رکھی تھیں، پوری طرح جان لڑا کر کام کیا۔

(۵) باوجودیکہ پنجاب کے اتنے وسیع رقبوں میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے اتنے وسیع پیمانے پر انتخابی جدوجہد کی اور اس میں مخالف جماعتوں اور امیدواروں کی شدید بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا، تاہم پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی جماعت کے کارکنوں نے بحیثیتِ مجموعی اخلاقی طہارت اور ضابطہ و قانون کی پابندی کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف حکومت کے عُمال اور مخالف پارٹیوں کے کارکنوں تک کو کرنا پڑا۔ الیکشن کے پورے کام کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو چار حلقوں کے سوا پورے پنجاب میں کہیں جماعت کے کارکنوں سے کسی اخلاقی کمزوری یا قانون و ضابطے کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا اور ان دو تین حلقوں میں بھی جماعت کے کارکن بحثیت مجموعی اس میں ملوث نہیں ہوئے بلکہ چند منفرد کارکنوں سے ...... اور زیادہ تر نئے کارکنوں سے ...... اس کا صدور ہوا۔

(٦) پورے پنجاب کی اس انتخابی جدوجہد میں جماعت اور پنچائتوں کا مجموعی خرچ صرف ایک لاکھ ستائیس ہزار روپیہ ہے۔ درآں حالیکہ مقابلہ ان لوگوں سے تھا جنہوں نے بعض جگہ ایک ایک سیٹ پر قریب قریب اتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔

(٧) باوجودیہ کہ پنجاب کے اس انتخاب میں حکومت کے دباؤ، زمینداری کے دباؤ، برادری کے تعصب اور روپے کے لالچ سے ووٹ حاصل کرنے کی بے تحاشا اور بہت بڑے پیمانے پر کوششیں کی گئیں اور ہر طرح دھاندلیوں سے کام لیا گیا، پھر بھی جماعت کی دعوت پر پنچائتی نمائندوں کے حق میں ٢١٧٨٥٩ آدمیوں نے ووٹ دیئے۔ (یہ شمار ووٹروں کا ہے نہ کہ ووٹوں کا، کیونکہ اکثر مقامات پر ایک ایک ووٹر کو دو دو آدمیوں کے لئے اپنا ووٹ استعمال کرنا تھا)۔ ان لوگوں کے ووٹ بہر حال دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی کے ذریعے سے تو کسی جگہ بھی حاصل نہیں کیے گئے۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ بعض مقامات پر پنچائتی نمائندوں کو ان کی برادری کے لوگوں نے برادری کے تعصب کی بناء پر رائے دی ہو۔ اگر ہم مبالغہ کے ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد کا تخمینہ مذکورہ بالا تعداد کا ١/٤ بھی لگائیں پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کے ان حلقوں میں جنہیں ہم نے انتخابی جدوجہد کے لئے اپنے چارج میں لیا تھا کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمی ایسے ضرور تھے جنہوں نے ہر دھمکی اور ہر لالچ کو نظر انداز کر کے خالص اصول کی خاطر اپنا ووٹ استعمال کیا۔

(٨) خصوصیت کے ساتھ جو چیز ہمارے لئے قابلِ اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخابی جدوجہد میں جتنی خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لئے کام کیا انہوں نے ہر جگہ شرعی پردے کی تمام حدود کی پوری طرح پابندی کی۔

درآں حالیکہ ایک آدھ پولنگ سٹیشن کی سوا پورے پنجاب کا کوئی پولنگ سٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں زنانہ پولنگ کے وقت حکومت اور سیاسی پارٹیوں اور مخالف امیدواروں نے پردے کی حدوں کا کچھ بھی لحاظ کیا ہو۔

یہ نتائج اس حالت میں نکلے ہیں کہ:

(۱) جماعت کو انتخابی جدوجہد کے آغاز ہی میں پریس کی طاقت سے محروم کردیا گیا اور اس کے روزانہ اخبار بند کر دیئے گئے۔

(۲) پورے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے جماعت کا عملاً بائیکاٹ کیا اور پریس کی اکثریت جماعت کی شدید مخالف رہی۔

(۳) اخبارات، رسائل اور اشتہارات اور تقریروں کے ذریعے سے جماعت کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی مہم چلائی گئیجائے گی اور خاص طور پر مولوی صاحبان اور پیروں کے ذریعے سے مذہبی بدگمانیاں پھیلانے کا ایک طوفان برپا کردیا گیا۔

(۴) جماعت کے کارکن پہلی مرتبہ انتخاب کے میدان میں اُترے تھے۔ اکثر و بیشتر کو پہلے سے انتخاب کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور اخلاقی قیود اور قانون و ضابطے کی پوری پابندی کے ساتھ الیکشن لڑنے کا موجودہ جمہوریت کی تاریخ میں یہ شاید پہلا تجربہ تھا۔

ان وجوہ سے مذکورہ بالا نتائج کو دیکھ کر مجلس شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور ہم کو پوری توقع ہے کہ اگر ہم رائے عام کی تربیت اور کارکنوں کی تیاری اور باشندگانِ ملک کی اخلاقی اصلاح کے لئے پیہم کوشش کرتے چلے جائیں تو آخر کار پُرامن آئینی ذرائع ہی سے یہاں اسلامی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا انتخابات کے بارے میں پالیسی کو حسب سابق جاری رہنا چاہیے اور جہاں کہیں ملک میں انتخابات ہوں ان میں حصہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ طریقۂ انتخاب کی اصلاح کا مسئلہ

پنجاب کے تازہ انتخابی تجربے کے دوران میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ ایک جمہوری نظام میں انتخابات کی آزادی اور صحت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور پوری قومی زندگی کی بہتری کا انحصار اس پر ہے کہ عام رائے دہندے آزادی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنے ووٹ کا استعمال کر سکیں۔ اگر انتخابات میں حکومت کی طاقت کے ذریعے سے مداخلت کی جائے، یا بااثر لوگ اپنی طاقت کے دباؤ سے ووٹ حاصل کریں، یا دولت مند لوگ اپنے مال سے ووٹ خریدیں، یا رائے عام کو ناجائز طریقوں سے دھوکہ دینے کی کوششیں کی جائیں۔ یا رائے شماری میں دھاندلیوں سے کام لیا جائے، تو اس کے نتائج اس قدر دُور رَس ہیں کہ ان سے نہ صرف پورے ملک کا نظام بگڑ سکتا ہے بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ لوگ آئینی ذرائع سے مایوس ہو کر غیر آئینی ذرائع کی طرف متوجہ ہو جائیں اور پوری قومی زندگی کا ارتقاء پُر امن جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر دہشت پسندی، ڈکٹیٹر شپ اور خُونی انقلاب کے راستے کی طرف جائے۔ اس لیے مجلسِ شوریٰ یہ ضروری سمجھتی ہے کہ تمام عناصر سے جو انتخابات کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ اربابِ حکومت ہوں یا سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن ہوں یا آزاد امیدوار ہوں، اپیل کی جائے اور پیہم کی جاتی رہے کہ وہ شخص اپنی شخصی یا جماعتی اغراض کی خاطر ملک کو اتنے بڑے نقصان اور خطرے میں مبتلا نہ کریں اور انتخابات کو دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مجلسِ شوریٰ کی رائے یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ہر انتخاب کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان ناجائز ذرائع کے خلاف تبلیغ کرنی چاہیے۔ ان کے نقصانات تقریر اور تحریر میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنے چاہئیں اور عام طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرنی چاہیے کہ ان تدابیر کے استعمال سے بڑھ کر اس ملک کے ساتھ اور کوئی غداری نہیں ہو سکتی۔

ضمیمہ نمبر ۲ فہرست مطبوعات

(اس کتابچے میں جن جن مطبوعات کا ذکر مختلف مراحل میں آیا ہے ان کی فہرست اسی ترتیب سے ذیل میں درج کی جاتی ہے تاکہ ناظرین کو ان کے حصول اور مطالعہ میں سہولت ہو)

پہلا مرحلہ

الجہاد فی الاسلام

مسئلہ جبر و قدر

تفہیمات

تنقیحات جلد اول

حقوق الزوجین

اسلام اور ضبطِ ولادت

دینیات

مطبوعات

اسلام کا نظریۂ سیاسی

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر

تجدید و احیائے دین

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

ایک اہم استفتاء

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

دوسرا مرحلہ

رسائل و مسائل (حصہ اول)

روداد جماعت اسلامی، حصہ اول

دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

تفہیم القرآن، جلد اول
سلامتی کا راستہ
دینِ حق
مرتد کی سزا
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم
سود

تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں
روداد جماعت اسلامی، حصہ سوم
شہادتِ حق
اسلامی نظام اور مغربی لادینی جمہوریت
بناؤ اور بگاڑ
روداد جماعتِ اسلامی حصہ پنجم
مسئلۂ قومیت

تیسرا مرحلہ

اسلام کا نظامِ حیات
اسلامی قانون
ذمیوں کے حقوق
مسئلۂ ملکیت زمین

یہ سب کتابیں حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور فون 1, 042-35417074